Regd. L. No. 7243

Phone. 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جون 1971

اس پرچہ میں

(۱) — اسلامی نظریۂ قومیت

(۲) — ہندو مذہب کیا ہے؟

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ **طلوعِ اسلام** لاہور

قیمت فی پرچہ
ایک روپیہ

ٹیلی فون
۸۰۸۰۰
خط و کتابت کا پتہ
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی۔ گلبرگ۔ لاہور

بدل اشتراک
پاکستان میں
سالانہ — دس روپے
غیر ممالک سے
سالانہ — ایک پونڈ

جلد (۲۴) — جون سنہ ۱۹۷۱ء — نمبر (۶)

فہرست

(۱) لمعات ———— ۲

(۲) علتِ مرض اور اس کا علاج ———— ۹

(۳) خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی — (محترم پرویز صاحب) — ۱۷

(۴) ہندو مذہب کیا ہے؟ ———— (محترم پرویز صاحب) ۴۵

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر سراج الحق۔ مقام اشاعت ۲۵/بی۔ گلبرگ۔ لاہور۔ پرنٹر شیخ محمد اشرف۔ مطبوعہ اشرف پریس۔ ایبک روڈ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

گذشتہ اشاعت (بابت مئی) کے لمعات کی تسوید کے وقت، ہم نے مغربی پاکستان کی کشتی کو جس گرداب میں چھوڑا تھا، وہ ابھی تک اسی میں چکر لگا رہی ہے — وہی دیرینہ بیماری، وہی ناحکمی دل کی — یعنی سابقہ انتخابات میں شکست خوردہ پارٹیوں کی ہر ممکن کوشش کہ انتخابات کالعدم قرار دیدیے جائیں، اور کامیاب گروہوں کی یہ خواہش کہ انہی انتخابات کی بنیادوں پر انتقالِ اقتدار عمل میں لایا جائے۔ ان متضاد عناصر کی باہمی تُو تُو، میں میں، بڑی تیزی سے "متشابہات" سے آگے بڑھ کر "محکمات" تک پہنچ رہی تھی جس سے ملک میں پھر سے ۱۹۶۸-۶۹ء کے خلفشار کے خدشات رونما ہو رہے تھے کہ صدر مملکت نے ایک جدید آرڈیننس کی رو سے، اس قسم کی تکا فضیحتی کو قانوناً ممنوع قرار دیدیا۔ خدا کرے کہ اس تنبیہ کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہو۔ اصل یہ ہے کہ ملک میں "سیاسی لیڈر" تو بیشمار پیدا ہو گئے ہیں، مصلح قوم کوئی ایک بھی نظر نہیں آتا۔ سیاسی لیڈر کے پیش نظر صرف اپنے یا اپنی پارٹی کے ہنگامی مفادات ہوتے ہیں۔ اُسے نہ اس سے غرض ہوتی ہے کہ قوم فکری یا اخلاقی طور پر کس قعرِ مذلت میں گر رہی ہے، اور نہ اس سے کوئی واسطہ کہ ملک کا مستقبل کیا ہوگا۔ اس وقت ملک کی حالت یہ ہے کہ اس کی معیشت (ECONOMY) نقطۂ انجماد سے بھی نیچے گر چکی ہے۔ قانون کا احترام مفقود ہو چکا ہے۔ جرائم وبائی امراض کی طرح عام ہو رہے ہیں۔ اخلاقی حیثیت سے قوم کا دیوالہ نکل چکا ہے۔ مصلحِ ملت ایسے حالات میں یہ نہیں دیکھتا کہ زمامِ اقتدار کس کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اپنی ساری تگ و تاز حالات کی اصلاح کے لئے وقف کر دیتا ہے اور اس مقصد کے لئے اربابِ نظم و نسق کی ہر اس تجویز سے پورا پورا تعاون کرتا ہے جو ملک اور قوم کی بہبود کے لئے سامنے آئے۔ اس کی یہ بے لوث خدمت اور پُرخلوص تگ و تاز اپنے اندر ایسی شدید کشش رکھتی ہے کہ اقتدار خود آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ چومتا ہے اور قوم، باصد مسرت کُلّہ اختیارات اس کے سر پر رکھ دیتی ہے۔

یہ حالات مغربی پاکستان کے ہیں۔ جہاں تک مشرقی پاکستان کا تعلق ہے، عسکری نظام جس حُسنِ تدبر اور بطشِ شدید سے حالات پر قابو پا رہا ہے وہ قوم کے لئے نہ صرف باعثِ صد مسرت و اطمینان ہے بلکہ سرمایۂ ہزار فخر و مباہات بھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فوج کا بنیادی فریضہ ملک کی حفاظت ہوتا ہے۔ اس کے نظم و نسق

سے اس کا تعلق نہیں ہوتا۔ لیکن مشرقی پاکستان میں فوجی نظام کو ان دونوں نہمات امور سے دوچار ہونا پڑا۔ ملک اندرونی اور بیرونی، ہر دو محاذات پر یکسر غیر محفوظ ہو چکا تھا۔ اس وقت وہاں صرف ایک ڈویژن فوج تھی۔ اس کے مقابلہ میں، جس قدر مخالف (مسلح) عنصر وہاں موجود تھا وہ تعداد کے لحاظ سے بھی ان سے کہیں زیادہ تھا اور اسلحہ کے اعتبار سے بھی۔ اس کے ساتھ، ہندوستان کی طرف سے نفری اور اسلحہ برابر چلا آ رہا تھا۔ مغربی پاکستان کی طرف سے براہ راست پرواز اور مواصلات کے سلسلے منقطع ہو چکے تھے۔ لہٰذا ادھر سے، وہاں کمک کا پہنچنا ناممکن بنا دیا گیا تھا۔ ایسے ناسازگار، حوصلہ شکن اور ہمت رُبا حالات میں، پورے کے پورے ملک میں اندرونی اور بیرونی خطرات کا مقابلہ، اور مقابلہ کے بعد ایسی نمایاں کامیابی — اس کی داد و تحسین آنے والا مورخ ہی دے سکے گا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی وہاں دوسرا مرحلہ اس سے بھی کہیں زیادہ پریشان کُن تھا۔ وہاں کا نظم و نسق معطل ہی نہیں، کالعدم ہو چکا تھا۔ یوں سمجھئے کہ چپڑاسی سے لے کر کمشنر تک، کوئی ایک بھی اپنی جگہ پر موجود نہیں تھا۔ اور نہ ہی یہ معلوم تھا کہ وہ ہیں کہاں، اور جن کا کچھ اتہ پتہ معلوم تھا ان کے متعلق بالوثوق طور پر نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ کس حد تک قابلِ اعتماد ہیں۔ ان حالات میں، پورے ملک کی نظم و نسق کی مشینری کو از سرِ نو چالو کرنا، معجزہ سے کم نہیں۔ یہاں بیٹھے ہوئے ہیں کیا معلوم کہ اس کے لئے ان ذمہ دار اربابِ حل و عقد کو وہاں کیا کچھ کرنا پڑا ہو گا — چناں داند حالِ ما سبک سارانِ ساحلہا — یہی ہیں وہ حاملینِ "کتاب و حدید" اربابِ قانون و شمشیر، جن سے قوم اور ملک کے مستقبل کی امیدیں وابستہ ہیں۔ خدا ان کی ہمتوں میں برکت عطا فرمائے۔

اب جبکہ ملک کی فضا میں نسبتاً سکون پیدا ہو گیا ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ ہمیں پھر اس علتِ مرض کی بات چھیڑ دینی چاہیئے جو ان تمام تباہیوں اور پریشانیوں کا بنیادی اور حقیقی سبب ہے۔ اس سلسلہ میں ہم قارئین کی خصوصی توجہ پرویز صاحب کی اس بصیرت افروز و حقیقت کشا تقریر کی طرف منعطف کرانا چاہتے ہیں جس سے انہوں نے گذشتہ عید میلادالنبیؐ کی تقریب پر سامعین سے خطاب فرمایا، اور جو چند صفحات آگے چل کر آپ کے سامنے آتی ہے۔ اس خطاب میں جس دقتِ نظر اور وسعتِ نگاہ سے حالات کا تجزیہ کر کے، پاکستان کے حقیقی اور اساسی مسئلہ (PROBLEM) کو سامنے لایا گیا ہے، اس کی بنا پر اگر اسے عہد ساز خطاب قرار دیدیا جائے تو اس میں قطعاً مبالغہ نہیں ہو گا۔ اس میں کہا گیا ہے کہ پاکستان کا اصلی مسئلہ دو قومی نظریہ ہے اور جب تک یہ اصل و بنیاد، ہماری نئی نسلوں کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترے گی اور وہ اسے قلب و دماغ کی کامل رضامندی سے، صداقت اور حقیقت تسلیم نہیں کریں گے، پاکستان کی سالمیت اور استحکام کی طرف سے کبھی مطمئن نہیں ہوا جا سکے گا — بلکہ یوں کہیئے کہ اس مملکت کا وجود ہمیشہ خطرہ میں رہے گا۔ اصل یہ ہے کہ (عصرِ حاضر میں) ہمارا یہ تجربہ بالکل منفرد تھا۔ اس زمانے میں، قومیت کی بنیاد (خاص حالات میں) نسل اور (عام حالات میں) وطنیت قرار پا چکی ہے۔ نظریہ کی وحدت کی بنا پر

قومیت کی تشکیل، اس دور میں یکسر نامانوس تصور تھا۔ نسل اور وطن کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل، از خود ہو جاتی ہے۔ اس کے لئے کچھ کرنا ہی نہیں پڑتا۔ لیکن نظریہ کی بنا پر، قوم کو خود متشکل کیا جاتا ہے۔ اور اس کے لئے متواتر کدو کاوش اور مسلسل سعی و عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی تعلیم و تربیت کے ذریعے، ہر بچے کے ذہن میں اس حقیقت کا راسخ کرنا کہ وہ ایک ایسے نظریہ زندگی کا حامل ہے جس کی مثال دنیا میں کہیں نہیں مل سکتی، دنیا کے جس قدر افراد اس نظریہ کے حامل ہیں وہ خون، رنگ، نسل، و زبان، وطن کے اختلاف کے باوجود ایک قوم (امت) کے ارکان ہیں، اور جو اس نظریہ کی صداقت کے قائل نہیں، وہ خون، رنگ، نسل، زبان، وطن کے اشتراک کے باوجود، دوسری قوم کے افراد —— ہم میں سے جو لوگ، تحریک پاکستان سے متاثر ہو کر "پاکستانی قوم" میں شامل ہو گئے تھے، وہ تو اس نظریہ کے قائل تھے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ان میں بھی بیشتر ایسے ہوں جو ذہنی طور پر اس نظریہ کی غایت و حقیقت تک نہ پہنچ پائے ہوں، لیکن قلبی طور پر وہ سب اس کے قائل اور اس پر مطمئن تھے۔ ان میں سے —— بہت آگے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں —— لیکن ہماری جو نسل پاکستان میں بر و مند ہوئی ہے، وہ مشرقی پاکستان میں ہو یا مغربی پاکستان میں، اس نظریہ کی لِم اور حقیقت سے قطعاً واقف نہیں۔ وہ نسل اور وطن ہی کو قومیت کی بنیاد سمجھتے ہیں۔ اور ظاہر ہے، کہ جب نسل کو قومیت کا معیار سمجھا جائے تو پھر بلوچی، سندھی، پنجابی، پٹھان، اپنے آپ کو ایک قوم کے افراد سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اور جہاں تک بنگالیوں کا تعلق ہے، وہ نسل اور وطن، دونوں اعتبارات سے اپنے آپ کو غیر بنگالیوں کے مقابلہ میں ایک جداگانہ الگ مستقل قوم کے افراد سمجھیں گے۔ اتنا ہی نہیں۔ وہ نسل اور وطن کے اشتراک کی بنا پر، بنگالی ہندو کو اپنی قوم کا جزو سمجھیں گے اور مغربی پاکستان کے مسلمان کو ایک دوسری قوم کا جزو۔ یہ ہے وہ مقام جس پر ہم اس وقت کھڑے ہیں۔ اگر کوئی شخص جان بوجھ کر اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لے تو اور بات ہے، ورنہ یہ ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے جسے اندھے بھی دیکھ اور بہرے بھی سُن سکتے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں جو کچھ ہوا وہ اسی کوہِ آتش فشاں سے ابلنے والا لاوا تھا۔ آپ نے بے شک اس لاوے کے دریا کے سامنے بند باندھ دیئے اور اس طرح ملک کو راکھ ہو جانے سے بچا لیا، لیکن ظاہر ہے کہ یہ اس خطرہ کا مستقل علاج نہیں۔ مشرقی پاکستان کے نوجوانوں کے دل میں یہ نقش راسخ ہے کہ مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان دو الگ الگ وطن ہیں اور ان میں بسنے والے دو جداگانہ قومیں۔ یہ احساس ہر وقت ان کے سینے میں ہیجان پیدا کرتا رہتا ہے کہ مغربی پاکستان کی قوم، ہزار میل دور سے آکر، ہم پر حکومت کر رہی ہے۔ ان کی غلامی سے آزاد ہونا، ہمارا قومی فریضہ ہے۔ آپ ان کے اس احساس کے مظاہر کو دبا سکتے ہیں۔ خود اس احساس کا ازالہ نہیں کر سکتے۔ اس کا ازالہ صرف صحیح تعلیم و تربیت کے ذریعے ممکن ہے۔ یہی کیفیت مغربی پاکستان کے نوجوانوں کی ہے۔ اسلام کا نظریہ قومیت ان کے دل و دماغ میں بھی نہیں اُترا۔ اس لئے کہ اسلام کی تعلیم انہیں بھی نہیں دی گئی۔

اور یہاں ہمارے سامنے ایک اور خطرہ آجاتا ہے جو پہلے خطرہ سے بھی زیادہ مہیب اور تباہ کن نتائج کا موجب ہے۔ اور یہ خطرہ ہے وہ تعلیم جو ہمارے بچوں کو اسلام کے نام سے دی جاتی ہے۔ جو

نوجوان (خوش قسمتی سے) اس تعلیم سے آشنا نہیں، وہ اسلام کے متعلق کم از کم اتنا حسن ظن ضرور رکھتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ اس میں کچھ اچھی باتیں بھی ہوں۔ لیکن جن کے کان میں اس کی کچھ بھنک پڑ جائے، وہ اسلام کے نام تک سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ اور وہ اس باب میں سچے ہیں۔

ہمارے ان آخری الفاظ سے قدامت پرست طبقہ کے ماتھے پر یقیناً بل پڑ جائیں گے ـــ اور اس باب میں وہ بھی سچے ہیں۔ ان میں اکثریت ان کی ہے جو محض بر بنائے عقیدت اسلام کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اس لئے انہیں جس بات کے متعلق کہہ دیا جائے کہ وہ اسلامی ہے، وہ اسے اسلامی سمجھ لیتے ہیں اور اس کے خلاف ایک لفظ تک بھی سننا گوارا نہیں کر سکتے۔ دوسرا گروہ ان میں وہ ہے جن کا ذریعہ معاش مروجہ اسلام ہے۔ اگر اس کے خلاف کچھ کہا جائے تو اس سے ان کی روٹی پر زد پڑتی ہے اس لئے وہ اس قسم کی آواز کو دبانے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ اس کا نہایت آسان طریقہ یہ ہے کہ عوام کو یہ کہہ کر مشتعل کر دیا جائے کہ یہ آواز اسلام کے خلاف ہے۔ اس سے تمہارا مذہب ختم ہو جائے گا، مسجدیں ویران ہو جائیں گی۔ نمازیں برباد ہو جائیں گی۔ تمہارے بچوں کے کان میں اذان دینے والا کوئی نہیں رہے گا۔ نکاح پڑھانے والا کوئی نہیں ہوگا۔ تمہارے مُردے بغیر جنازہ پڑھائے دفن کر دیئے جائیں گے ـــ وعلیٰ ہذا۔

دوسری طرف ہمارا وہ طبقہ ہے جسے اس کا علم نہیں کہ جو تعلیم اسلام کے نام سے دی جاتی ہے، وہ ہے کیا؟ اس لئے جب ہم کہتے ہیں کہ اس تعلیم سے ہمارا نوجوان طبقہ دین سے متنفر اور برگشتہ ہو رہا ہے، تو یہ بات ان کی سمجھ میں بھی نہیں آتی۔

اور تیسری طرف، ہمارا وہ طبقہ ہے جسے اس کا علم و احساس ہے کہ یہ تعلیم کس قدر تباہ کن نتائج پیدا کر رہی ہے، لیکن وہ یہ کہہ کر چل دیتے ہیں کہ بھائی! یہ بات چھیڑ کر بھڑوں کے چھتے میں پتھر کون مارے۔

اس سے پہلے یہ تعلیم، مذہبی مکتبوں اور دارالعلوموں تک محدود تھی اس لئے مدرسوں اور کالجوں کے طلبا اس سے ناآشنا رہتے تھے اور اس کے زہر سے متاثر نہیں ہوتے تھے۔ لہٰذا، ان کے دل میں اسلام کا کچھ نہ کچھ احترام ضرور رہتا تھا۔ اس سلسلہ میں یہاں ایک نہایت گہری چال چلی گئی۔ یہ ظاہر ہے کہ پاکستان میں ایسے عناصر موجود ہیں جن کی شدید ترین مخالفت کے علی الرغم یہ مملکت وجود میں آ گئی تھی اس لئے ان کے دل میں اس کے خلاف آتش انتقام سلگ رہی تھی۔ اس انتقام جوئی کی ایک شکل یہ تھی کہ جدید تعلیم یافتہ نسل کو اسلام سے برگشتہ کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جب وہ نفس اسلام کی طرف سے برگشتہ اور متنفر ہو جائیں گے تو وہ اسلام کے نظریۂ قومیت اور پاکستان کی آئیڈیالوجی کے حامی کبھی نہیں ہو سکیں گے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے مسلسل شور مچایا کہ مدرسوں اور کالجوں میں "اسلامیات" کی تعلیم عام (بلکہ لازمی) ہونی چاہیئے ـــ اور یوں "اسلامیات" داخلِ نصاب ہو گئی۔ اِدھر یہ کیا۔ اور اُدھر، ایم۔ اے (اسلامیات) میں اُن طالب علموں کو خصوصیت سے داخل کرایا گیا جو ان کے مسلک سے متفق ہوں۔ یہ طلباء ایم۔ اے کرنے کے بعد، مختلف کالجوں میں اسلامیات کے پروفیسر تعینات ہو گئے۔ اس طرح، قریب قریب ہر کالج میں ان کے (CELL) قائم ہو گئے۔

اب رہا یہ کہ 'اسلامیات' کے نام سے پڑھایا کیا گیا، سو اس سلسلہ میں ہم صرف اتنا عرض کریں گے کہ

(جن حضرات کو اس موضوع سے دلچسپی یا اس کی اہمیت کا احساس ہو وہ) بچوں کے نصاب سے لے کر ایم۔اے کے نصاب تک میں سے، کوئی سی کتاب اٹھا کر دیکھ لیں۔ انہیں معلوم ہو جائے گا کہ اس میں قوم کے طالب علموں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کا کس قدر مسالہ موجود ہے یہ دیکھئے اور پھر سوچئے کہ وہ نوجوان جنہیں اسلام سے اس طرح متنفر کیا جائے، وہ کبھی نظریۂ پاکستان یا اسلام کے نظریۂ قومیت کے قائل ہو سکیں گے؟

اب ایک قدم آگے بڑھئے۔ شور مچایا گیا کہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اسلام کے متعلق پروگرام ہونے چاہئیں شور مچانے کا نتیجہ تھا کہ پروگرام شروع ہو گئے۔ ان تقاریر، مذاکرات اور مکالمات کی نوعیت، معیار اور ماحصل کیا ہوتا ہے، اسے معلوم کرنے کے لئے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ آپ کسی تعلیم یافتہ نوجوان کو یہ پروگرام سنائیے اور اس کے بعد تاثرات معلوم کیجئے، بات واضح ہو جائے گی کہ یہ پروگرام انہیں اسلام سے دل برداشتہ کرنے میں کس قدر کامیاب ہیں۔۔۔ نوجوان تو ایک طرف، چھوٹے چھوٹے بچے بھی جب ٹیلی ویژن پر اس قسم کے پروگرام سنتے اور دیکھتے ہیں تو وہ حیرت سے پوچھتے ہیں کہ کیا یہ واقعی سچ ہے؟ کیا اسلام کی یہی تعلیم ہے۔

اس کے بعد ہماری صحافت سامنے آتی ہے۔ خواہ اخبار کی پالیسی یکسر لادینی ہو، اور اس کے مدیر دھریئے، لیکن اس میں مذہب سے متعلق ایک کالم (روزانہ نہیں تو ہفتہ وار، یا کم از کم اسلامی تقریبات پر) ضرور ہونا چاہیئے۔ کاروباری نقطۂ نگاہ سے یہ نہایت ضروری ہے۔ پھر جو کچھ ان کالموں میں لکھا جاتا ہے، اس سے علم شرماتا اور عقل ہنستی ہے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، اسے معلوم کرنے کے لئے کسی دن کافی ہاؤس میں جا بیٹھئے۔ نتیجہ بلا حجابانہ سامنے آ جائے گا۔

یہ ہے جو کچھ ہمارے ہاں اسلام کے نام سے ہو رہا ہے، اور اس کے بعد ہم رونا روتے ہیں کہ قوم کا نوجوان طبقہ نظریہ پاکستان کی ہنسی اڑاتا ہے اور دو قومی نظریہ کو عہد جاہلیت کی یادگار قرار دیتا ہے۔

بات صاف اور واضح ہے۔ اگر ہم پاکستان کی سالمیت اور بقا کے آرزومند ہیں تو ہمیں، قوم کی نئی نسلوں کے قلب و دماغ کی تعمیر، صحیح بنیادوں پر کرنی ہوگی۔ اس کے لئے کرنے کا کام یہ ہوگا کہ:۔

(۱) تعلیم کے پورے نظام کو بدلا جائے۔

(۲) دینی تعلیم اور دنیاوی تعلیم کی موجودہ ثنویت کو ختم کیا جائے۔ مدرسوں اور کالجوں میں تعلیم اس طرح دی جائے کہ طالب علم جو مضمون بھی پڑھے، اسے ساتھ کے ساتھ معلوم ہوتا جائے کہ اسلام اس باب میں کیا کہتا ہے۔

(۳) اسلام کا نظریۂ حیات کیا ہے۔ مملکت پاکستان کی بنیاد کس نظریہ پر رکھی گئی تھی۔ دو قومی نظریہ سے مراد کیا ہے اور وہ کس طرح اسلامی نظام سیاست کی اصل و بنیاد ہے۔۔۔ ان اصولی حقائق پر مشتمل ایک علیحدہ لازمی مضمون ہو جسے شروع سے آخر تک مسلسل پڑھایا جائے۔

(۴) اساتذہ کا انتخاب کرتے وقت اس امر کا پورا پورا اطمینان کر لیا جائے کہ وہ نظریۂ پاکستان اور دو قومی نظریہ پر کما حقہٗ عبور رکھتے ہیں۔

(۵) نظریہ پاکستان اور دو قومی نظریہ کی پوری وضاحت کرنے کے بعد، موجودہ اساتذہ سے اس امر کا اقرار لیا جائے کہ وہ ان نظریات پر ایمان رکھتے ہیں، اور اس بات کا عہد کہ وہ جلوت و خلوت میں ان نظریات کے خلاف کہیں کچھ نہیں کہیں گے، اور اگر کہیں یہ نظریات موضوع بحث ہوں گے تو وہ ان کے حق میں بولیں گے۔ ظاہر ہے کہ مذکورہ

بالا اقرار نامہ کی رو سے کوئی غیر مسلم ہماری درسگاہوں میں بطور معلم آ ہی نہیں سکے گا۔

(۶) ہمارے اسلاف نے جو کچھ مذہب کے نام سے لکھا ہے، اسے عام تعلیم کا جزو نہ بنایا جائے کیونکہ اس سے اختلافات ابھرتے اور تفرقہ پیدا ہوتا ہے۔ اسے ریسرچ سکالرز کا مخصوص موضوع قرار دیا جائے

(۷) موجودہ ایڈمنسٹریٹو سٹاف کالج کی طرز پر، ہر صوبہ میں ایک ایڈیولوجیکل کالج ہو جس میں کارپردازانِ حکومت کو اسلامی نظریاتِ حیات پر لیکچر دیئے جائیں اور اس کے بعد ان کا ٹسٹ لیا جائے۔

(۸) ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخبارات، اور دیگر وسائل نشر و اشاعت کے ذریعے، اسلامی نظریاتِ زندگی کو عام کیا جائے، اور ان کے خلاف کچھ کہنا یا لکھنا قانوناً ممنوع قرار دیا جائے۔ نیز ہر ایسی بات کو بھی جس سے فحاشی بے حیائی۔ توہم پرستی، عام ہوتی ہو۔

اسے ہم پھر دہرا دیں کہ اس مقصد کے لئے پہلا قدم یہ ہے کہ اس امر کی کھلے کھلے الفاظ میں وضاحت کی جائے کہ نظریۂ پاکستان سے مراد کیا ہے اور دو قومی نظریہ سے مقصود و مطلوب کیا۔ اس وقت ہو یہ رہا ہے کہ ہر شخص ان الفاظ کو دہرائے جا رہا ہے اور کوئی نہیں بتاتا کہ ان سے متعین طور پر مفہوم کیا ہے؟

یہ ہے اس پروگرام کی پہلی کڑی کے وہ اصول جن کی جزئیات، احوال و ظروف کے مطابق مرتب کی جا سکتی ہیں۔ نیز اس امر کا تعین بھی کیا جا سکتا ہے کہ اس منزلِ مقصود تک کس طرح تدریجاً پہنچا جا سکتا ہے۔

اس پروگرام کی دوسری کڑی، دو قومی نظریہ کا عملی نفاذ ہے۔ اس نظریہ کا عملی مفہوم یہ ہے کہ پاکستان میں بسنے والے غیر مسلم، پاکستانی قوم کے افراد نہیں۔ وہ نہ ہمارے امور مملکت میں حصہ لے سکتے ہیں، اور نہ ہی انہیں شریکِ حکومت کیا جا سکتا ہے۔ وہ، نہ تو انتخابات میں رائے دینے کے حقدار ہیں اور نہ ہی کسی نشست کے لئے امیدوار بننے کے اہل۔ ان کی جان، مال، عزت، آبرو، مذہبی عقائد و رسوم پرستش کی حفاظت کی ذمہ داری، حکومت پاکستان پر عائد ہوگی۔ نیز وہ اپنے شخصی معاملات کے تصفیہ کے لئے، حکومت کی منظوری سے، اپنے لئے جداگانہ مناسب انتظام کر سکیں گے۔ لیکن مملکت پاکستان سے متعلق امور میں شریک نہیں ہو سکیں گے۔

بعض پارٹیوں کی طرف سے آجکل یہ سوال بڑے زور شور سے اٹھایا جا رہا ہے کہ انتخابات مخلوط کے بجائے جداگانہ ہونے چاہئیں۔ جداگانہ انتخاب کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان امیدواروں کے لئے صرف مسلمان رائے دیں، اور غیر مسلموں کے لئے غیر مسلم، لیکن صرف اتنے سے تو مسئلہ حل نہیں ہو جاتا۔ اگر غیر مسلم امیدوار نے غیر مسلموں کی آراء ہی سے سہی، کامیاب ہو کر، پاکستان کی مجالس آئین و قوانین ساز کا ممبر بن جانا ہے، اور وہاں انہیں مسلمان ممبروں جیسے حقوق حاصل ہونے ہیں تو یہ اسلامی مملکت کا تصور نہیں۔ اسلامی مملکت میں مشاورت، صرف بَیْنَھُمْ ہوتی ہے۔ یعنی صرف مسلمانوں کے درمیان — کوئی غیر مسلم اس میں شریک نہیں ہو سکتا۔ جو پارٹیاں جداگانہ انتخاب کے حق میں شور مچا رہی ہیں، انہیں واضح طور پر بتانا چاہیئے کہ مملکت پاکستان میں غیر مسلموں کو حقوق کیا حاصل ہوں گے! لیکن آپ دیکھیں گے

کہ اس کی جرأت کوئی نہیں کرے گا۔ یہ کیفیت قدامت پسند طبقہ کی ہے۔ جہاں تک ماڈرن طبقہ کا تعلق ہے، وہ اس بات ہی کو سننا نہیں چاہتا کہ اسلامی مملکت پاکستان میں غیر مسلم اسمبلیوں کے ممبر نہیں بن سکیں گے۔ وہ کہتا ہے کہ اس سے ہم اقوامِ عالم کی نگاہوں میں "غیر مہذب" قرار پا جائیں گے۔ یہ ساری دنیا سے انوکھا تصور ہے، جس کی، آج کی مہذب دنیا میں، کوئی گنجائش نہیں۔ ہم ان حضرات سے اتنا پوچھنا چاہتے ہیں کہ۔

(۱) جب آپ نے غیر منقسم ہندوستان میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ اسلام کی رُو سے، کوئی غیر مسلم، مسلمان قوم کا فرد قرار نہیں پا سکتا۔ اسلام کے اس تقاضے کی بنا پر ہم مسلمان، ہندوؤں سے الگ اور متمیز قوم ہیں۔ اور اسی حیثیت سے ہم اپنی الگ آزاد مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ تو کیا یہ دعویٰ اور مطالبہ ساری دنیا سے انوکھا نہیں تھا! اُس وقت آپ اس "انوکھے" دعوے کو بڑے فخر سے پیش کرتے تھے، لیکن آج اس دعوے کا نام لینے سے شرماتے ہیں کہ ہم دنیا میں غیر مہذب قرار پا جائیں گے۔ اگر اُس وقت یہ دعویٰ باعثِ فخر تھا تو اسے آج بھی موجبِ افتخار ہونا چاہیئے۔ اور اگر یہ آج باعثِ شرم ہے تو اسے اُس وقت بھی موجبِ ندامت ہونا چاہیئے تھا۔ ہم ان حضرات سے گزارش کریں گے کہ بات کرنے سے پہلے ذرا دل میں سوچیں کہ وہ کہہ کیا رہے ہیں اور اس کی زد کہاں تک پہنچتی ہے!

(۲) آپ نے غیر منقسم ہندوستان میں، اپنی آزاد مملکت کے مطالبہ کی بنیاد اس دعویٰ پر رکھی تھی کہ اس مملکت میں ہم اسلامی نظریات کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں کیا آپ بتائیں گے کہ اسلامی نظریہ کے مطابق، ایک اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کی پوزیشن کیا ہوتی ہے؟ اگر ان کی پوزیشن وہی ہو جس کی صراحت اوپر کی گئی ہے تو فرمایئے کہ اس کے عملی نفاذ پر آپ کو کیا اعتراض ہے؟ اور اگر آپ کا ڈر وہ ہے جسے اکبر نے بہت پہلے بھانپ کر کہا تھا کہ ؎

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

اگر آپ "اس زمانے میں" اسلام کا نام لینے سے شرماتے ہیں، تو بات کھل کر کیجیے۔ اور کھل کر بات کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ تسلیم اور اعلان کیجیے کہ

(۱) ہم نے جس قدر دعاوی تحریک پاکستان کے دوران کیے تھے، وہ سب فریب پر مبنی، اور مطلب براری کے حیلے تھے۔ ہم دل سے ان پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔

(۲) مملکت پاکستان ایک سیکولر حکومت ہوگی جس میں شخصی معاملات مذہب کی رُو سے فیصل ہوں گے اور امورِ مملکت عام طریق جمہوریت کی رُو سے۔

(۳) قومیت کی بنا وطنیت ہوگی، نہ کہ دین کا اشتراک۔

اس سے آپ کو بھی دنیا کے سامنے شرمانے کی ضرورت نہیں رہے گی اور قوم کے "مجیبوں" کو بھی آزاد بنگلہ دیش کی مملکت کے قیام کے لئے مستحکم بنیاد مل جائے گی!

اس پروگرام کی تیسری کڑی یہ ہے کہ مشرقی پاکستان میں بسنے والے ہندوؤں کو سیاسی اعتبار ہی سے نہیں

(باقی صفحہ ۴۴ پر دیکھیے)

علّتِ مرض ـــ اور اُس کا علاج

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (۳۰/۴۱)

انسانوں کے خود ساختہ نظامِ زندگی کا نتیجہ ہے کہ ساری دنیا میں تباہیاں مچ رہی ہیں۔

کہتے ہیں کہ انسان کی تمدنی زندگی کا آغاز آج سے قریب چھ ہزار سال پہلے ہوا۔ اربابِ علم و تحقیق، انسانی تاریخ کے اس چھ ہزار سالہ دور کے متعلق جو کچھ کھوج لگا سکے ہیں، اس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اگرچہ اس کی تاریخ، خوں ریزیوں اور فساد انگیزیوں کی ایک مسلسل داستان ہے، لیکن جس انداز کی تباہی موجودہ زمانے میں رونما ہوئی ہے، اس کی مثال اس سے پہلے کہیں نہیں ملتی۔ اس سے پہلے جو تباہیاں آتی تھیں، ایک تو وہ ایک خاص خطۂ زمین تک محدود ہوتی تھیں، اور دوسرے، ان کے نتائج و عواقب اتنے دور رس نہیں ہوتے تھے۔ عصرِ حاضر میں، وسائلِ رسل و رسائل کی وسعت و کثرت کا نتیجہ ہے کہ جو آگ کسی ایک خطۂ زمین میں بھڑکتی ہے، اس کے شعلے (بالواسطہ یا بلا واسطہ) پورے کے پورے کرۂ ارض کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں ـــ اور اب تو شاید یہ شعلے ابھر کر اجرامِ فلکی تک کو بھی محیط ہو جایا کریں گے ـــ دوسری طرف، ان شعلہ خیزیوں اور شرر باریوں کے انجام و عواقب وقتی اور ہنگامی نہیں ہوتے، یہ آنے والی نسلوں تک مسلسل پھیلتے چلے جاتے ہیں۔ یہی ہیں وہ مکان فراموش اور زمان ناآشنا تباہیاں ـــ جن کا نقشہ قرآنِ کریم نے اُس آیۂ جلیلہ کے چار الفاظ میں نہایت جامعیت سے کھینچ کر رکھ دیا ہے جو زیبِ عنوان ہے۔

جو اربابِ علم و بصیرت، انسانیت کا درد اپنے دل میں رکھتے ہیں، وہ اس صورتِ حال سے انتہائی دل گرفتہ اور آہ بلب رہتے ہیں اور ان تباہیوں کے اسباب و علل دریافت کرنے کے لئے مصروفِ تحقیق و تدقیق۔ لیکن ان کی اس تمام سعی و کاوش کی کیفیت یہ ہے کہ وہ آج جس نتیجہ پر پہنچے ہیں ـــ اور اس کا علاج اس طرح سے کرتے ہیں کہ گویا انہوں نے اس فردوسِ گم گشتہ کا سراغ پا لیا ہے جس کی تلاش میں جنت سے نکالا ہوا ابنِ آدم مارے مارے

بھر رہا ہے ـــــ لیکن ہنوز اس جشنِ مسرت کی شب چراغاں کی سحر بھی نہیں ہونے پاتی کہ اس تشخیص و تدبیر کے نتائج اس کی ناکامی کے ماتم گسار بن جاتے ہیں۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ اس کی وجہ وہ سیاسی نظام ہے جس سے قوموں کے مفاد ایک دوسرے سے ٹکراتے اور باہمی آویزشوں کا موجب بنتے رہتے ہیں۔ کہیں یہ کہا جاتا ہے کہ اس کا باعث وہ معاشی نظام ہے جس سے طبقات وجود میں آتے ہیں اور طبقاتی نزاع ان کے باہمی تصادمات کا موجب بنتی ہے کوئی کہتا ہے کہ اس کی وجہ حکومتوں کی انتظامی مشینری کی کمزوری ہے جس سے لاقانونیت کی روک تھام نہیں ہوتی اور کوئی اسے نظامِ تعلیم و تربیت کی خرابی پر محمول کرتا ہے جس سے نوجوانوں میں جنسی بدبنیادیاں اور سرکشی و قانون شکنی کے رجحانات عام ہوتے چلے جاتے ہیں۔ سطحی نگاہ سے دیکھئے تو یہ اسباب موجودہ بے راہ روی اور عالمگیر تباہیوں کے بڑے مؤثر عوامل دکھائی دیں گے۔ لیکن سطح سے ذرا نیچے اتر کر دیکھئے تو یہ اسباب صرف علاماتِ مرض ثابت ہوں گے علتِ مرض نہیں ـــ اور علتِ مرض تک یہ دیدہ ور ہیچ نہیں رہے۔ اس کی وجہ بھی ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی۔

قرآن کریم علاماتِ مرض سے بحث نہیں کرتا وہ علتِ مرض کی نشاندہی کرتا ہے جب کہتا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ۔ (۱۳/۱۱) یعنی قوموں کی زندگی کی عمارت اس کے نظریۂ حیات کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ غلط نظریۂ حیات کا لازمی نتیجہ تباہیاں اور بربادیاں ہوتا ہے اور صحیح نظریۂ حیات کے فطری برگ و بار سرفرازیاں اور خوشگواریاں۔ قرآن کریم کی اس تشخیص کی رو سے عصرِ حاضر کی تباہیوں کی بنیادی اور اساسی وجہ وہ نظریۂ حیات ہے جس نے اس وقت عالمگیر حیثیت اختیار کر رکھی ہے۔

یہ نظریۂ حیات کیا ہے؟ یہ کہ انسانی زندگی دیگر حیوانات کی طرح محض طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE) ہے۔ انسان طبیعی قوانین کے مطابق حیوانات کی طرح کھاتا پیتا، افزائشِ نسل کرتا اور اس کے بعد مر جاتا ہے۔ اور جب وہ مر جاتا ہے تو وہ ختم ہو جاتا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَیَاْکُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ الْاَنْعَامُ۔ (۱۲/۴۷) یہ لوگ جو حیوانی زندگی سے بلند زندگی کے قائل نہیں ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ حیوانات کی طرح کھاتے پیتے (اور بالآخر مر جاتے ہیں)۔ دوسری جگہ قرآن کریم نے کہا ہے کہ اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ۔ (۷/۱۷۹)۔ یہ لوگ حیوانات کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔ یہ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ ـــ ایک گہری حقیقت کا ترجمان ہے۔ حیوانات پر فطرت نے خود پابندیاں عاید کر رکھی ہیں جنہیں ان کی جبلت کہا جاتا ہے۔ اور حیوانات کو اس کا اختیار نہیں ہوتا کہ وہ ان پابندیوں کو توڑ سکیں۔ لیکن انسان پر فطرت نے کوئی کنٹرول نہیں رکھا۔ دوسری طرف اس کی قوتیں بھی لامحدود ہیں۔ اب آپ کسی ایسے حیوان کا تصور ذہن میں لائیے جسے لامحدود قوتیں حاصل ہوں اور ان قوتوں کو وہ جس طرح جی چاہے استعمال کرے۔ اس پر اس باب میں فطرت کی طرف سے کوئی پابندی عاید نہ ہو۔ نیز وہ حیوان کسی جنگل میں اکیلا نہ ہو ـــ اس قسم کے بہت سے ـــ ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں

۔۔۔ حیوان ہوں اور ان سب نے اکٹھے رہنا ہو۔ اس کے بعد آپ سوچئے کہ اس کا نتیجہ خون ریزیاں اور فساد انگیزیاں نہیں ہوں گی تو اور کیا ہوگا!

انسانی قوت کے استعمال پر پابندیاں سوسائٹی کی طرف سے عاید ہوتی ہیں۔ سوسائٹی ٭ انہی افراد کے مجموعہ کا نام ہوتا ہے۔ اسے بالفاظِ دیگر یوں سمجھئے کہ انسان خود مل بیٹھ کر طے کرتے ہیں کہ ہمیں اس قسم کی پابندیوں کے تابع زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ اس مقصد کے لئے کہ یہ انسان، ان پابندیوں کو ملحوظ رکھیں۔ یہ بھی طے کرلیا جاتا ہے کہ ان میں سے جو شخص ان پابندیوں کو توڑے گا، اسے یہ سزا ملے گی۔ اسے سوسائٹی کا قانونِ عدل کہا جاتا ہے۔ اس قانونِ عدل کو بروئے کار لانے کے لئے سوسائٹی ایک مشینری وضع کرتی ہے جسے انتظامیہ (پولیس وغیرہ) کہا جاتا ہے۔ اس انتظامیہ کے لئے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ معاشرہ کے ایک ایک فرد کے سر پر ایک ایک نگران مقرر کردے جو ہر وقت دیکھتا رہے کہ وہ، ان قوانین کی پابندی کرتا ہے یا نہیں۔ یہ اس انتظام کا پہلا نقص ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو قانون شکنی انتظامیہ کی نگاہوں سے اوجھل رہے، اس پر کسی قسم کی گرفت نہیں ہو سکتی۔ عقل حیلہ گر انسان کو سینکڑوں ایسی تدابیر سمجھا دیتی ہے کہ اس کی قانون شکنی کسی کی گرفت میں نہ آسکے۔

اس انتظام کا دوسرا نقص یہ ہے کہ خود انتظامیہ کی مشینری بھی انہی جیسے انسانوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ جو اپنے مفاد کی خاطر، قانون شکنی سے تسامح برتتے یا ان سے تعاون کرنے لگ جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں قانون شکنی عام ہو جاتی ہے ۔۔۔ اتنی عام کہ اس کی روک تھام سوسائٹی کے بس میں نہیں رہتی اور اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ وہ خود اس قانون ہی کو منسوخ قرار دے دے۔ سوسائٹی کی اس بے بسی سے قانون کا احترام ہی باقی نہیں رہتا۔

یہ تو رہی پابندیوں کی عدم پابندی۔ جہاں تک حسنِ اخلاق کا تعلق ہے، اس نظریۂ زندگی کی رو سے، اس کے لئے کوئی جذبۂ محرکہ ہی نہیں ہوتا۔ مثلاً قانون کی رو سے آپ اس کے تو پابند ہو سکتے ہیں کہ آپ کسی کے ہاں چوری نہ کریں۔ لیکن دنیا کا کوئی قانون آپ کو اس بات پر مجبور نہیں کر سکتا کہ آپ کسی محتاج کی امداد کریں۔ اس کا تعلق حسنِ اخلاق سے ہے۔ اور طبیعی نظریۂ زندگی کی رو سے، کوئی شخص اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا کہ میں کسی محتاج کی مدد کیوں کروں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ تم محتاج کی مدد اس لئے کرو کہ اگر کل کو تم محتاج ہو جاؤ، تو دوسرا تمہاری مدد کرے۔ لیکن یہ جواب جس قدر بودا اور یہ جذبہ جس قدر کمزور ہے، وہ ظاہر ہے۔ اگر ایک شخص اس کا انتظام کرے کہ اسے کسی کی امداد کی ضرورت ہی نہ پڑے تو اس کے لئے یہ دلیل بے بنیاد ہو جاتی ہے۔ دراصل، یہ دلیل حسنِ سلوک کے لئے جذبۂ محرکہ نہیں بلکہ کاروباری ذہنیت پیدا کرنے کا موجب بن سکتی ہے ۔۔۔ یعنی میں کسی کو کچھ دوں تا کہ کل کو عند الضرورت وہ مجھے کچھ دے۔ یہ خالصتاً بزنس ہے۔ یہ تو رہا ایک قوم کے اندر افراد کا

باہمی معاملہ ـــ جہاں تک اقوام کا باہمی معاملہ ہے حیوانی نظریۂ زندگی کی رُو سے، کوئی عوامل ایسے مؤثر نہیں ہو سکتے جو کسی بالادست قوم کو کمزور قوم پر دست درازی کرنے سے روک سکیں۔ اقوام عالم نے بین الاقوامی امور کے تصفیہ کے لئے پیس لیگ آف نیشنز کی طرح ڈالی تھی اور اس کی ناکامی کے بعد اب اقوامِ متحدہ کی تشکیل کر رکھی ہے۔ لیکن تجربہ شاہد ہے کہ وہاں بھی بالادست قوتوں کی کارفرمائی ہے۔ زیردستوں کی کچھ شنوائی نہیں ہوتی۔ اور یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں۔ حیوانی نظریۂ زندگی میں "جنگل کے قانون" سے برتر کوئی قانون ہو نہیں سکتا۔ اور جنگل کا قانون یہی ہے کہ ہر زیردست، بالادست کا شکار ہوتا ہے۔

اب آپ نے غور فرمایا کہ اس وقت عالمگیر تباہیوں نے جس بُری طرح سے نوعِ انسان کو گھیر رکھا ہے، اس کی بنیادی وجہ کیا ہے؟ اس کی بنیادی وجہ ہے حیوانی نظریۂ زندگی۔ اسی کو مادی نظریۂ حیات یا (MATERIALISTIC CONCEPT OF LIFE) کہتے ہیں۔ یہ نظریہ یوں تو قدیم ایام سے چلا آرہا تھا، لیکن انیسویں صدی عیسوی میں اس نے یورپ میں نمایاں شہرت حاصل کی اور اس کے بعد رفتہ رفتہ اس نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جو مذہب پرست طبقہ، زبانی اس نظریہ کی مخالفت کرتا ہے عملاً وہ بھی اسی کا پیرو ہے۔ ان کی وجۂ امتیاز چند مذہبی رسوم سے زیادہ کچھ نہیں۔ اکبر کے الفاظ میں۔

شیخ صاحب وہی کرتے ہیں جو سب کرتے ہیں
یہ الگ بات ہے، ہم ان کا ادب کرتے ہیں

(۵)

اس کے برعکس، قرآن کریم انسانی زندگی کا ایک اور نظریہ پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کی زندگی محض طبیعی زندگی نہیں۔ اس کے اندر ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے۔ وہ نہ طبیعی قوانین کی پیدا کردہ ہے، نہ طبیعی قوانین کے تابع۔ اور نہ ہی انسان کی طبیعی زندگی کے ختم ہو جانے کے ساتھ (جسے موت کہا جاتا ہے) اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ وہ اس کے بعد بھی زندہ رہتی ہے۔ اسے حیاتِ آخرت کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ انسانی جسم کی نشو ونما یا اضمحلال و انحطاط، طبیعی قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔ لیکن انسانی ذات کی نشو ونما یا ضعف و انحطاط، مستقل اقدارِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے۔ مثلاً انسان اگر اچھی غذا کھاتا ہے تو اس سے اس کے جسم کی عمدہ پرورش ہوتی ہے۔ لیکن اگر وہ غذا ناجائز دولت سے حاصل کردہ ہوتی ہے تو اس سے اس کی ذات کمزور ہو جاتی ہے۔ اسی طرح انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر پڑتا ہے۔ اس کا جو عمل اقدارِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے اس سے اس کی ذات کی نشو ونما ہوتی ہے۔ جو اس کے خلاف ہوتا ہے، اس سے اس کی ذات میں ضعف اور انتشار واقع ہو جاتا ہے۔ انسانی اعمال کے اثرات اس کی ذات پر

از خود مرتب ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے لیے کسی خارجی مشینری کی ضرورت نہیں ہوتی۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ انسانی اعمال اور ان کے اثرات کو تین شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) ایسے اعمال جن کا اثر طبیعی ہوتا ہے' اور وہ محدود ہوتا ہے فردِ متعلقہ کے جسم تک۔ مثلاً ایک شخص افیون کھاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے اس کی اپنی طبیعی قوتیں مضمحل اور افسردہ ہو جائیں گی۔ کسی دوسرے پر اس کا اثر نہیں پڑے گا۔

(۲) ایسے اعمال جن کا اثر معاشرہ پر پڑتا ہے۔ مثلاً ایک شخص چوری کرتا ہے، اس کے اس عمل کا اثر معاشرہ کے دیگر افراد پر پڑتا ہے۔ اس کی روک تھام کے لئے معاشرہ قوانین مرتب کرتا ہے اور ان قوانین کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دی جاتی ہے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ ایسے اعمال کا ایک اور پہلو بھی ہے چونکہ چوری کرنا (یا دوسروں کا مال باطل طریق سے حاصل کرنا) ایک مستقل قدر کی خلاف ورزی بھی ہے، اس لئے اس کا اثر انسان کی ذات پر بھی مرتب ہوتا ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ وَمَنْ يَكْسِبْ إِثْمًا فَإِنَّمَا يَكْسِبُهُ عَلَىٰ نَفْسِهِ۔ (۴/۱۱۱) جو شخص کوئی جرم کرتا ہے تو (ہر چند وہ جرم معاشرہ کے کسی قانون کے خلاف ہوگا۔ اور اس کا نقصان کسی دوسرے فرد کو ہوگا۔ لیکن) درحقیقت' مجرم وہ جرم خود اپنی ذات کے خلاف کرتا ہے۔ اس جرم کے سلسلہ میں، وہ معاشرہ کی عدالتی مشینری کی گرفت میں آتا ہے یا نہیں اور اسے وہاں سے سزا ملتی ہے یا نہیں' اس کا تعلق معاشرہ سے ہے۔ لیکن اس کا مضر اثر اس کی ذات پر بہر حال پڑتا ہے۔ اس سے وہ بچ نہیں سکتا۔

(۳) تیسری شق ایسے اعمال پر مشتمل ہے جن کا نہ تو کوئی طبیعی اثر انسان کے جسم پر مرتب ہوتا ہے (جس طرح شق اول میں بیان کیا گیا ہے) اور نہ ہی معاشرہ پر (جیسے شق دوم میں کہا گیا ہے) ان کا اثر صرف فردِ متعلقہ کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کسی کی کوئی چیز چرانے کی نیت کرتا ہے۔ لیکن نہ اسے چراتا ہے اور نہ ہی اسے چرانے کے لیے کوئی عملی اقدام کر پاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی اس نیت اور ارادہ کا نہ تو کوئی طبیعی اثر اس کے جسم پر مرتب ہوتا ہے اور نہ ہی یہ معاشرہ کے کسی قانون کی زد میں آتا ہے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ اس کی ذات پر اس کا مضر اثر مرتب ہو جاتا ہے۔ کیونکہ غلط ارادہ بھی مستقل اقدار کی خلاف ورزی میں شامل ہے۔

شق اول سے متعلق اعمال کے سلسلہ میں ہم نے (بغرضِ تفہیم) یہ کہا ہے کہ ان کا اثر طبیعی ہوتا ہے اور ان اعمال کے مرتکب تک محدود۔ لیکن بنظرِ غائر دیکھا جائے تو ان کا اثر ایک لحاظ سے' انسانی ذات پر بھی پڑتا ہے۔ توانا جسم اور عمدہ صحت' اقدارِ خداوندی کے مطابق کام کرنے کے لئے لاینفک ذرائع ہیں' اس لئے جو اعمال' انسان کی صحت اور توانائی پر مضر اثرات مرتب کرتے ہیں' وہ بھی بالواسطہ' انسانی ذات کے ضعف کا موجب بنتے ہیں۔ لہٰذا، اس قسم کے اعمال کا اثر بھی انسانی ذات پر پڑتا ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ انسان کے ہر عمل کا اثر، بالواسطہ یا بلاواسطہ، اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے اور اس کے لئے نہ تو داروگیر کی کسی خارجی مشینری کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی کسی عدالت کی طرف سے سزا ملنے کی حاجت. یہی ہے وہ مقام جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ أَيَحْسَبُ أَن لَّمْ يَرَهُ أَحَدٌ (۹۰/۷) کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اسے کوئی دیکھ نہیں رہا؟ اگر وہ ایسا سمجھتا ہے تو وہ فریب نفس میں مبتلا ہے۔ جو اثرات اس کی ذات پر مرتب ہوتے ہیں ان کے لئے اس کی ضرورت ہی نہیں کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے یا نہیں۔ "کسی کے دیکھنے یا نہ دیکھنے" کا سوال ان اعمال کی صورت میں پیدا ہوتا ہے جو مرئی اور محسوس ہوں۔ لیکن وہاں تو یہ کیفیت ہے کہ يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ (۴۰/۱۹) دل میں گزرنے والے خیالات اور نگاہ کی خیانتوں تک بھی چھپی نہیں رہ سکتیں۔ وہ بھی اپنا اثر مرتب کرکے رہتی ہیں۔ اس کے لئے نہ کسی سپاہی کی ضرورت ہوتی ہے، اور نہ ہی گواہ کی حاجت۔ بَلِ الْإِنسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ (۷۵/۱۴) انسان خود اپنے خلاف آپ محاسب اور گواہ ہوتا ہے۔ اس کے لئے نہ کسی تھانے میں ہسٹری شیٹ کھولنے کی ضرورت پڑتی ہے، نہ "بنبر الف یا بنبر ب" مرتب کرنے کی حاجت۔ كُلَّ إِنسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ (۱۷/۱۳) ہر انسان کا ہسٹری شیٹ اس کی گردن میں لٹکا رہتا ہے۔ اسے کوئی اور پڑھ کر بھی نہیں سناتا۔ اقْرَأْ كِتَابَكَ (۱۷/۱۴) وہ اپنا اعمالنامہ خود آپ پڑھتا ہے۔ وَكَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا (۱۷/۱۴) اور پھر اپنی جزا اور سزا کا حساب بھی خود ہی کرتا ہے۔

(۵)

جس طرح افراد کے معاملہ میں مستقل اقدار کی خلاف ورزی گرفت اور سزا کا موجب بنتی ہے، اسی طرح اقوام کی صورت میں بھی ان اقدار سے سرکشی کا نتیجہ ان کی تباہی اور بربادی ہوتا ہے۔ اقوام بھی تو افراد ہی کا مجموعہ ہوتی ہیں۔ مستقل اقدار کی خلاف ورزی سے افراد کی ذات تشتت و اضمحلال کا شکار ہو جاتی ہے، اور اس قسم کے افراد پر مشتمل قوم، اجتماعی طور پر تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم نے بےشمار مقامات پر اقوام سابقہ کے جرائم اور ان کی وجہ سے ان کی تباہی اور بربادی کا عبرت آموز تذکرہ کیا ہے۔ ان اقوام کے احوال و کوائف بیان کرنے کے بعد حضور نبی اکرمؐ کے مخالفین کو مخاطب کرکے کہا گیا۔

وَلَقَدْ مَكَّنَّاهُمْ فِيمَا إِن مَّكَّنَّاكُمْ فِيهِ ۔ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَأَبْصَارًا وَأَفْئِدَةً ۔ فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَا أَبْصَارُهُمْ وَلَا أَفْئِدَتُهُم مِّن شَيْءٍ إِذْ كَانُوا يَجْحَدُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَحَاقَ بِهِم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ۔ (۴۶/۲۶)

ان اقوام کو ہم نے ملک میں اس قدر قوت اور تمکن عطا کر رکھا تھا کہ ایسی قوت اور تمکن
تمہیں بھی نصیب نہیں۔ انہیں دیکھنے، سننے، سمجھنے، سوچنے کی صلاحیتیں حاصل تھیں۔
لیکن جب انہوں نے قوانینِ خداوندی سے سرکشی کی راہ اختیار کی تو ان کی یہ صلاحیتیں
بیکار ہو کر رہ گئیں اور جس تباہی کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے، اس نے انہیں چاروں طرف
سے گھیر لیا۔

ان قوموں کے جرائم کی جو تفصیل قرآن کریم نے دی ہے، وہ طول طویل ہے۔ لیکن ملخص ان کا یہ ہے کہ وَإِذَا بَطَشْتُم بَطَشْتُمْ جَبَّارِينَ ۔ (۲۶/۱۳۰) وہ کمزوروں اور زیر دستوں کو ظلم و استبداد کے آہنی شکنجہ میں اس شدت سے جکڑتے تھے کہ ان بیچاروں کی ہڈیاں ٹوٹ جاتی تھیں۔ جہاں تک فرد اور معاشرہ کا تعلق ہے، ناقص ہی سہی، لیکن پھر بھی ایک معاشرتی نظامِ عدل ایسا ہوتا ہے جو فرد کو ارتکابِ جرم سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن قوموں کی صورت میں اس قسم کا کوئی نظام نہیں ہوتا جو بالراست قوم کو، کمزور اقوام پر ظلم اور زیادتی کرنے سے روکے۔ (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) قوموں کے نزدیک "جنگل کا قانون" ہی نہجِ زندگی ہوتا ہے۔ یعنی اس میں ہر طاقتور کو حق حاصل ہوتا ہے کہ کمزور کو چبا ڈالے۔ اس کے برعکس جب کوئی ایسی قوم برسرِ اقتدار آئے جو حیاتِ آخرت پر ایمان رکھتی ہو، تو اس کا فریضۂ زندگی، بلکہ ان کے اقتدار کی وجۂ جواز یہ ہوتی ہے کہ وہ مظلوموں کی حفاظت اور کمزوروں کی مدافعت کرے۔ وہ لوگ دنیا میں عدل کے محافظ اور انصاف کے پاسبان بن کر جیتے ہیں۔ ان کے نزدیک، عدل کی حدود کہاں تک پھیلتی ہیں، اس کا اندازہ اس ایک اصول سے لگائیے جس پر وہ عمل پیرا ہوتے ہیں کہ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا — اِعْدِلُوا ۔۔۔ (۵/۸) دیکھنا! کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم اس سے عدل نہ کرو۔ ہمیشہ عدل کرو۔ دشمن کے ساتھ بھی عدل کرو۔ اس سے ایک قدم اور آگے بڑھ کر کہا کہ مظلوم کی فریاد کہیں سے آئے، فوراً اس کی امداد کے لئے پہنچو۔ اسے ظالم کی گرفت سے بچاؤ خواہ اس میں تمہیں اپنی جان تک بھی کیوں نہ دینی پڑ جائے۔ (۴/۷۵) دنیا کے ہر انسان — بلاتفریق رنگ، نسل، زبان، وطن، مذہب و ملت — کی جان، مال، عزت، آبرو، عصمت، معابد کی حفاظت کرو، کہ تمہیں صاحبِ اقتدار اس مقصد کے لئے بنایا گیا ہے۔ اس قوم کے سامنے، فلاح و بقا کا اصول یہ ہوتا ہے کہ

وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ (۱۳/۱۷)

وہی قوم، وہی نظام، وہی نظریۂ زندگی باقی رہ سکتا ہے جس کے پیشِ نظر کسی خاص قوم، خاص قبیلہ، خاص ملک، کا مفاد نہیں بلکہ پوری کی پوری نوعِ انسان کی منفعت ہو۔ وہ اس اصول پر عمل پیرا ہونے سے بقا اور حیاتِ دوام حاصل کرتے ہیں۔

——— (٭) ———

آپ نے دیکھا کہ مغرب کا مادی نظریۂ حیات اور قرآن کا حیاتِ آخرت کا نظریہ کس طرح ایک دوسرے کی ضد ہیں اور ان کے عملی نتائج کس طرح باہدگر متخالف۔ آج ساری دنیا جس جہنم میں گرفتار ہے، وہ مادی نظریۂ حیات کا فطری نتیجہ اور اس کے شجرۃ الزقوم کا لازمی برگ وبار ہے۔ جب تک انسان اس نظریۂ حیات کا قائل رہے گا، اس جہنم کی آگ زیادہ سے زیادہ شعلہ خیز ہوتی جائے گی۔ اس کا علاج، اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس نظریۂ حیات کو بدلا جائے اور اس کی جگہ ایمان بالآخرت کو انسانی قلب کی گہرائیوں میں راسخ کیا جائے۔

لیکن ہم نے، دوسروں کا ذکر کیا، یہ ایمان تو آج اس مسلمان کے دل کی گہرائیوں میں بھی راسخ نہیں جو اس ایمان کے دعویٰ کی بنا پر اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے۔ اس کا طریقہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس نظریۂ حیات کو بچوں کے نصابِ تعلیم کی اساس و بنیاد قرار دیا جائے اور اس طرح یہ ان کے تصورات و معتقدات کی رگوں میں خونِ زندگی بن کر دوڑے۔ اسی میں اس (مسلمان) قوم کی زندگی کا راز ہے اور اسی سے انسانیت کی فوز و فلاح وابستہ!

(باقی)

معذرت

ہمیں افسوس ہے کہ کاغذ کے حصول میں دقت کی وجہ سے طلوعِ اسلام کا پچھلا پرچہ تاخیر سے شائع ہوا۔ اس سے قارئین کو جو پریشانی ہوئی، اس کا ہمیں پورا پورا احساس ہے لیکن ہم مجبور تھے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ صورتِ حالات کچھ دیر تک اور بھی رہے، اس لئے ہم قارئین سے درخواست کریں گے کہ وہ پرچہ نہ ملنے کی اطلاع ۱۰ تاریخ کے بعد دیا کریں۔

حکومت نے کاغذ پر جو پابندیاں عاید کی ہیں ان کی وجہ سے ہم پرچے کی ضخامت کم کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ ہمیں اس کا بھی افسوس ہے لیکن ہم معذور ہیں۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ قلم کو خفی اور بین السطور کو کم کر کے کسی حد تک اس کی تلافی کریں لیکن اس سے بھی تلافی پوری پوری نہیں ہو سکے گی۔

ہمارا ارادہ ہے کہ ہم تفصیل سے لکھیں کہ مشرقی پاکستان میں کیا ہوا، کیوں ہوا، کیسے ہوا، اس کی ذمہ داری کس پر ہے وغیرہ۔ امید ہے قارئین اس کا دلچسپی سے انتظار کریں گے۔

(ناظم)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی"

اسلامی نظریۂ قومیت

خطاب بتقریبِ سعید "عیدِ میلاد النبیؐ" - منعقدہ ۹ مئی ۱۹۷۱ء

پرویز

عزیزانِ گرامی قدر! سلام و رحمت،

یوں تو کشتیٔ عمرِ رواں کے ہر مسافر کو ساحلِ مراد تک پہنچنے کے لئے روشنی کے مینار کی ضرورت ہوتی ہے لیکن جب صورت یہ ہو کہ — شبِ تاریک و بیمِ موج و گردابے چنیں حائل — تو اُس وقت اس مینار کی راہ نمائی کی ضرورت اور بھی اشد، اور اُس کی اہمیت کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اِس وقت، مملکتِ پاکستان کے موجِ ناتواں کا سفینۂ برگِ گل کچھ اس طرح ہجومِ بلا میں گھر رہا ہے کہ ہر قلبِ حساس کا شانۂ صد اضطراب ہے اور ہر چشمِ بینا آئینۂ ہزار خطرات۔ خارجی قوتوں کی پیدا کردہ تلاطم خیزیاں اور سیلاب انگیزیاں تو شروع ہی سے اسے اپنے گھیرے میں لئے چلی آرہی تھیں، لیکن اب جو خود کشتی کے مسافروں نے اس کے چندے میں سوراخ کئے ہیں تو اس کی سلامتی مخدوش ہوگئی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تباہیاں اور بربادیاں اس طرح اندر اور باہر سے یورش کرکے امنڈ آئیں اور تاریکیوں کے بادل چاروں طرف چھا رہے ہوں، تو روشنی کے مینار کی راہ نمائی کس قدر غنیمت کا آخری سہارا بن جاتی ہے۔ ہماری آفت رسیدہ کشتیٔ امت کے لئے روشنی کا یہ مینار، اُس حاملِ قندیلِ آسمانی کا اُسوۂ حسنہ ہے جسے خود اس کے بھیجنے والے نے سراجاً منیراً کہہ کر پکارا ہے (۳۳/۴۶) اور جس کی شمعِ نورانی کو نور السمٰوٰت والارض قرار دیا ہے۔ ہم آج اُسی درخشندہ روشنی کے پائندہ مینار سے راہ نمائی حاصل کرنے کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں تاکہ ہماری یہ ضعیف و ناتواں سی کشتی، اس گردابِ بلا سے نکل کر صحیح و سلامت ساحلِ مراد

تک پہنچ جائے۔

پاکستان پر تازہ حملہ

عزیزانِ من! جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، پاکستان دشمن قوتیں، روزِ اول ہی سے ہمارے دریے تخریب چلی آرہی ہیں لیکن ان کے حملوں کی مثال آسمان سے گرنے والی بجلی کی سی تھی جو عمارت کے بالائی حصے (SUPER - STRUCTURE) کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ لیکن اس دفعہ جو حملہ ہم پر ہوا ہے اس کی مثال زلزلہ کی سی ہے جو عمارت کی بنیاد کو تہ و بالا کر دیتا ہے اور اس کے بعد اس کا بالائی حصہ خود اپنے بوجھ سے نیچے آگرتا ہے۔ میں آج کی نشست میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وہ بنیاد کیا تھی جس پر ہماری اس مملکت کی رفیع الشان عمارت استوار ہوئی تھی اور حالیہ یورش اور سازش سے اس بنیاد میں کس طرح تزلزل واقع ہو گیا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے متعلق کہا تھا کہ ۔۔۔ میری تمام سرگزشت، کھوئے ہوؤں کی جستجو ۔۔۔ اور میں اپنے متعلق اس سے زیادہ اور کیا عرض کروں کہ میری تمام سرگزشت، قرآنی نظریۂ حیات کی تعلیم و تلقین کی "سعیٔ نامشکور" ہے۔ میں نے اس سعی کو "نامشکور" اس لئے کہا ہے کہ میں قریب تیس سال سے ان تصورات کو مسلسل قوم کے سامنے پیش کر رہا ہوں، لیکن اس دبستانِ فکر و نظر کے طلبا کی کیفیت یہ ہے کہ یہ ہر بار امتحان میں فیل ہو جاتے ہیں اور مجھے اسی کلاس کو بار بار، الف، بے، سے سبق شروع کرانا پڑتا ہے۔ غالبؔ کے الفاظ میں ؎

لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ "رفت" گیا، اور "بود" تھا

بنا بریں، میں اس قصۂ زلفِ چلیپا کو آج پھر اور سرِ نو چھیڑنا چاہتا ہوں اور بتانا چاہتا ہوں کہ اسلام کا نظریۂ قومیت کیا ہے اور یہ نظریہ کس طرح خود اسلام کی اساسی تعلیم اور مملکتِ پاکستان کی اصل و بنیاد ہے اور اس باب میں ہمیں اس ذاتِ اقدس و اعظم کے تابندہ نقوشِ قدم سے کیا راہ نمائی ملتی ہے جو ہر راہ رو سفرِ حیات کے لئے خضرِ طریقت ہیں۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

انسان کی ابتدائی زندگی

عزیزانِ من! قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ انسان نے جب اپنی تمدنی زندگی کی ابتدا کی ہے تو وہ ایک مختصر سی آبادی تھی جو ایک گروہ کی شکل میں بستی رہتی تھی۔ کَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً۔ لیکن بعد ازاں جب ان کے مفادات میں ٹکراؤ ہوا تو ان میں اختلافات پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ فَاخْتَلَفُوْا۔ (۲/۲۱۳) انہی اختلافات و تنازعات کا نتیجہ وہ فساد کی چنگاریاں اور خون کے چھینٹے تھے جنہیں ملائکہ نے ہیولیٰ آدم میں بھانپا تھا، اور خدا سے کہا تھا کہ اَتَجْعَلُ فِیْهَا

مَنْ یُّفْسِدُ فِیْھَا وَ یَسْفِکُ الدِّمَآءَ (۲/۳۰) کیا تو کرۂ ارض پر اس مخلوق کو صاحبِ اقتدار بنانا چاہتا ہے جو وہاں خوں ریزیاں کرے گی اور فساد کی آگ بھڑکائے گی! یہی وہ خوں ریزی تھی جسے قرآن نے ہابیل و قابیل کے مشہور قصے میں تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے اور جس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ زمین پر پہلا قتل تھا۔ قرآن نے نہ تو ہابیل اور قابیل کا نام لیا ہے اور نہ ہی یہ کہا ہے کہ وہ نوعِ انسان کا پہلا قتل تھا۔ اس نے جو کچھ کہا ہے وہ اس نظریۂ زندگی کی اساس ہے جو آج کی نشست میں ہمارا موضوعِ سخن ہے اور جس میں فکرِ انسانی کے لئے ہزار سامانِ تدبر موجود ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آدم کے دو بیٹے تھے ۔ یعنی بنی آدم کے دو افراد ۔ "بیٹے" کہنے سے اس نے وہ سب کچھ کہہ دیا جس کا اظہار اس کے مقصدِ پیشِ نظر کے لئے

آدم کے دو بیٹے

ضروری تھا۔ یعنی ان دونوں کی نسل ایک تھی، ان کا وطن ایک تھا، ان کی زبان ایک تھی۔ آج کی اصطلاح میں یوں سمجھیئے کہ ذہنِ انسانی نے قومیت کی تشکیل کے لئے جن جن عناصر کے اشتراک کو ضروری قرار دیا ہے، وہ ان دونوں میں سب موجود تھے۔ اور اس طرح وہ دونوں ایک ہی قوم کے افراد تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان میں سے ایک نے دوسرے کو قتل کر دیا۔ کیوں قتل کر دیا؟ اس لئے کہ ان میں نظریۂ زندگی کا اختلاف تھا۔ ایک کا نظریہ یہ تھا کہ خدا کے نزدیک وجۂ تقرب قوانینِ خداوندی کی نگہداشت (تقویٰ) ہے اور دوسرا قوت کے نشہ میں بدمست تھا۔ اِس نے اُسے قتل کر دیا۔ اس سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے نسل، زبان، رنگ، وطن کا اشتراک انسانوں کو باہمی خوں ریزیوں سے نہیں بچا سکتا۔ یہ صرف مبنی بر حقیقت نظریۂ حیات ہے جس سے انسانوں میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور قلب و نگاہ کی یہی ہم آہنگی و یک رنگی انسانوں کے باہمی تصادمات کو روک سکتی ہے۔ اسی سے فساد مٹ سکتے اور خوں ریزیاں رُک سکتی ہیں۔ چنانچہ جہاں قرآن نے کہا ہے کہ انسانوں میں اختلافات رونما ہو گئے تو اسی سلسلہ میں دوسری جگہ مذکور ہے کہ خدا نے انبیاء کو بھیجا تاکہ وحیٔ خداوندی کی رُو سے لوگوں کے باہمی اختلافات کو دور کریں۔ اور اس طرح انہیں پھر امّتِ واحدہ بنا دیں۔ کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً فَبَعَثَ اللّٰہُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ وَ اَنْزَلَ مَعَھُمُ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ لِیَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ فِیْمَا اخْتَلَفُوْا

انبیاء کی تعلیم

فِیْہِ۔ (۲/۲۱۳) نوعِ انسان ایک برادری تھی (پھر انہوں نے آپس میں اختلافات پیدا کر لئے تو) خدا نے انبیاء کو بھیجا جو مبشر بھی تھے اور منذر بھی۔ اور ان کے ساتھ کتاب نازل کی تاکہ وہ لوگوں کے اختلافات اس کے ذریعے مٹا دیں۔

آسمانی سلسلۂ رشد و ہدایت کی ساری تاریخ، اسی بنیادی حقیقت کی بصیرت افروز و دل کشا داستان ہے۔ یعنی انسان، رنگ، نسل، زبان، وطن کے اختلاف کی بنا پر قبیلوں اور گروہوں میں بٹ کر ایک دوسرے

کی جان کے دشمن بن جاتے تھے، اور حضرات انبیاء کرامؑ تشریف لا کر ان میں نظریۂ حیات کی بنا پر ہم آہنگی فکر و نظر پیدا کر کے انہیں ایسی امت بنا دیتے تھے جس میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا تھا۔ بالفاظِ دیگر حضرات انبیاء کرامؑ کی بعثت اس حقیقت کی شہادت ہے کہ انسانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ کی بنیاد کیا ہو سکتی ہے — نسل، رنگ، زبان، وطن کا اشتراک، یا نظریۂ زندگی کی یکسانیت! — اس داستان کی ابتداء حضرت نوحؑ کے تذکارِ جلیلہ سے ہوتی ہے۔ ارشاد ہے۔ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ (۷/۵۹) ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ یہاں اِلٰی قَوْمِهٖ کہہ کر یہ واضح کر دیا کہ حضرت نوحؑ اسی قوم کے ایک فرد تھے۔ دوسری جگہ انہیں اَخَاهُمْ کہہ کر اس کی مزید وضاحت کر دی کہ وہ اور دیگر افراد قوم ایک ہی نسل سے متعلق تھے۔ یعنی ان سب کی نسل بھی ایک تھی اور وطن بھی ایک۔ ایک اور جگہ کہا ہے کہ ہر رسول کی زبان بھی وہی ہوتی تھی جو اس کی قوم کی زبان تھی۔ یعنی ان میں زبان کا اشتراک بھی تھا۔ اب ظاہر ہے کہ انسانوں کے خود ساختہ معیارِ قومیت کے لحاظ سے وہ ایک ہی قوم کے افراد تھے۔ لیکن حضرت نوحؑ نے یہ کہہ کر ان کی مخالفت کی کہ جس نظریۂ زندگی کے تم حامل ہو وہ باطل ہے۔ کہا جائے گا کہ قوموں میں اس قسم کے مصلحینِ اخلاق پیدا ہوتے رہتے ہیں جو قوم کے اخلاقی عیوب کی مخالفت کرتے اور ان کی اصلاح کا بیڑہ اٹھاتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ اسی قوم کے افراد رہتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے۔ اور جب مذہب کو (اخلاقیات کی طرح) ایک پرائیویٹ مسئلہ سمجھ لیا جائے۔ تو اس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے۔ لیکن انبیاء کرامؑ دین کے داعی ہوتے تھے اور دین کسی کا پرائیویٹ معاملہ نہیں ہوتا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اسی قوم سے جن افراد نے حضرت نوحؑ کی دعوت پر لبیک کہا، وہ ایک مختلف قوم کے افراد قرار پا گئے۔ چنانچہ قرآن کریم نے انہیں جماعتِ مومنین کہہ کر اس کی تصریح کر دی کہ وہ اپنی قوم سے الگ، ایک اور قوم کے افراد بن گئے تھے، اور ان میں اور ان کی (سابقہ) قوم میں کوئی شے قدرِ مشترک نہیں رہی تھی۔ اور وطن اور زبان تو ایک طرف، ان کا خاندانی رشتہ بھی منقطع ہو گیا تھا۔ چونکہ یہ تفریق و تخصیص پہلی دفعہ سامنے آئی تھی اس لئے قرآن کریم نے اس کی مزید وضاحت یہ کہہ کر کر دی کہ اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا تھا کہ حضرت نوحؑ کے "اہل" کو غرقابی سے بچا لیا جائے گا۔ جب ان کا بیٹا ان کے سامنے ڈوبنے لگا تو انہوں نے خدا سے کہا کہ آپ نے تو مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میرے "اہل" کو بچا لیا جائے گا تو پھر میرے بیٹے کو کیوں نہیں بچایا جاتا۔ تو اس کے جواب میں کہا گیا کہ اے نوحؑ! تیرا یہ خیال غلط ہے کہ تیرا بیٹا تیرے اہل میں سے ہے۔ اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۔ (۱۱/۴۶) چونکہ اس کا نظریۂ زندگی مختلف ہے، اس لئے وہ تیرا بیٹا ہونے کے باوجود تیرے اہل میں سے نہیں ہے۔ اسی طرح ان کی بیوی کے متعلق بھی کہا کہ چونکہ وہ نظریۂ زندگی میں تیری ہم نوا نہیں، اس لئے تیرا اس سے کوئی تعلق نہیں (۶۶/۱۰)۔

قرآنِ کریم نے مختلف انبیاء کرامؑ (حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت لوطؑ، حضرت شعیبؑ وغیرہ

(علیہم السلام) کے متعلق بھی یہی کہا کہ وہ اپنی اپنی قوم کے انبیاء اور ان کے بھائی بندوں میں سے تھے۔ انہی میں انہوں نے اپنے نظریۂ زندگی کی تبلیغ کی اور جن لوگوں نے اسے قبول کر لیا، وہ ایک الگ قوم کے افراد قرار پا گئے۔ (حضرت نوحؑ کی بیوی کی طرح، حضرت لوطؑ کی بیوی کا بھی ذکر خصوصیت سے آیا ہے۔ (۶۶/۱۰) اجمالی طور پر ان تمام رسولوں کے متعلق کہا کہ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ۔ (۱۰/۷۴) ان رسولوں کو ان کی قوم کیطرف بھیجا۔ جن لوگوں نے ان کے پیش کردہ نظریۂ حیات کی تردید و تکذیب کی وہ تباہ ہو گئے۔ ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ (۱۰/۱۰۳) اور اپنے رسولوں کو اور جو لوگ ان کے نظریۂ حیات پر ایمان لائے تھے، انہیں تباہی سے محفوظ رکھا۔

نظریۂ زندگی کی بنا پر اپنی قوم سے الگ ہو کر ایک جداگانہ قومیت کی تشکیل کے مسلک کو داستانِ حضرت ابراہیمؑ میں مزید وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔

داستان حضرت ابراہیمؑ

انہوں نے سب سے پہلے، اپنے گھر میں اپنے باپ کے سامنے اس نظریہ کو پیش کیا اور کہا کہ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا۔ (۱۹/۴۳) اے میرے باپ! مجھے میرے خدا کی طرف سے وہ علم ملا ہے جو تیرے پاس نہیں۔ اس لئے اپنی غلط روش کو چھوڑ اور میرا اتباع کر۔ میں تجھے زندگی کے صحیح راستے پر چلاؤں گا۔ اور جب باپ نے اس نظریہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو آپ نے کہا۔ سَلٰمٌ عَلَيْكَ (۱۹/۴۷) اچھا! خدا حافظ! آپ جانیں آپ کا کام۔ میرا آپ سے کوئی تعلق نہیں۔ پھر آپ نے اپنے پیغام کو اپنی قوم کے سامنے پیش کیا اور انہوں نے بھی اس کی مخالفت کی۔ پھر ملک کے بادشاہ کے سامنے پیش کیا اور اس نے بھی اس سے انکار کیا تو آپ نے ان سب سے برملا کہہ دیا کہ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ تم اگر اس نظریہ زندگی کو نہیں مانتے تو میرا تم سے کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ میں تم سے بھی قطع علائق کرتا ہوں اور تمہارے معبودوں سے بھی۔ كَفَرْنَا بِكُمْ۔ سن رکھو کہ ہم تمہارے نظریۂ حیات سے کھلے بندوں انکار کرتے ہیں وَ بَدَا بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا۔ اور اس انکار و اختلاف کے یہ معنی نہیں کہ یہ ایک پرائیویٹ معاملہ تھا۔ تم نے یوں مان لیا۔ ہم نے دون۔ بات ختم ہوئی۔ اس میں جھگڑا کاہے کا ہے۔ نہیں۔ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ اس سے تم میں اور ہم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے عداوت اور نفرت رہے گی۔ اس عداوت کے ختم ہونے کی ایک، اور صرف ایک صورت ہو گی۔ اور وہ یہ کہ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ۔ (۶۰/۴) تم بھی ہماری طرح اس نظریۂ حیات کو قبول کر لو۔ اور اگر تم ایسا نہیں کرتے تو میرا اس خطۂ زمین سے بھی کوئی واسطہ نہیں۔ نظریۂ زندگی کے مقابلہ میں وطن کی جاذبیت کوئی شے نہیں۔ اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ۔ (۳۷/۹۹) لو میں چلا اپنے رب کی طرف۔ تمہارے خون کے رشتے

تمہاری قومی نسبتیں، تمہاری وطن کی جاذبیت۔ تمہیں مبارک۔ مجھے اُس باپ، اُس خاندان، اُس قوم، اُس وطن سے کیا تعلق جو میرے خدا کے عطا کردہ نظریۂ حیات کے مخالف ہے۔ میں اُس سرزمین کو جا کر اپنا وطن بناؤں گا جو اس نظریۂ زندگی کے لئے سازگار ہوگی اور ان افراد سے اپنے رشتے استوار کروں گا جو اس نظریہ میں مجھ سے ہم آہنگ ہوں گے۔ میں ایک نیا دیس بساؤں گا اور اس میں ایک نئی قوم متشکل کروں گا۔ چنانچہ وہ وہاں سے نکلے اور دنیا کے بتکدے میں اُس پہلے گھر کی بنیاد رکھی جو نسل، رنگ، زبان، وطن کی نسبتوں سے بلند، ان افرادِ انسانیہ کا مرجع و ماویٰ قرار پایا جو خدا کے عطا کردہ نظریۂ حیات کو اپنا لینے سے ایک جداگانہ اُمت کے قالب میں ڈھل گئے ہوں۔

یہ تھا وہ مسلکِ ابراہیمی جس کے متعلق ہم سے کہا گیا کہ لَقَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ۔ (۶۰/۴) تمہارے لئے ابراہیمؑ اور اس کے رفقاء کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔ اور یہی تھی وہ روش جس کی وجہ سے کہا گیا کہ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا (۲/۱۲۴) ابراہیمؑ! تم نوعِ انسانی کی لیڈرشپ کے مستحق قرار پا گئے ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی بھی وضاحت کر دی کہ یہ لیڈرشپ تمہاری اولاد میں ملوکیت کی طرح وراثت میں نہیں چلے گی۔ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ۔ (۲/۱۲۴) ان میں سے جو اس معیار پر پورا نہیں اترے گا، وہ اس منصب سے محروم کر دیا جائے گا۔ اور یہی تھی وہ حقیقتِ کبریٰ جس کے پیشِ نظر صنمکدۂ نسل و وطن و قوم کے اس بت شکن نے اعلان کر دیا کہ

فَمَنْ تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي۔ (۱۴/۳۶)

سن رکھو! اور اچھی طرح سے جان لو کہ میرا وہ ہے جو میرے مسلک کا اتباع کرتا ہے۔ جو اس کے خلاف چلتا ہے اس کا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔

یہ ہے اپنے اور بیگانے کا وہ ازلی معیار جسے اس معمارِ حرم، اس خدائے واحد کے محکوم، اس مسلم قانت، اس حنیفِ مخلص نے اس بلند آہنگی سے پیش کیا اور جس پر عمل کر کے، دنیا میں تشکیلِ امت اور تعمیرِ قومیت کا درخشندہ نمونہ قائم کر دکھایا۔

یہ تھے وہ حضرات انبیاء کرام، جو مختلف زمانوں میں، مختلف قوموں میں، زمین کے مختلف خطوں میں، مختلف زبانیں بولنے والی قوموں میں، پیدا ہوتے رہے، لیکن ان تمام اختلافات کے باوجود، خدا نے ان کے متعلق کہا کہ

إِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً ۖ وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ۔ (۲۱/۹۲)

یہ سب ایک ہی امت کے افراد، ایک ہی تسبیح کے دانے، اور ایک ہی لڑی کے موتی تھے۔ رنگ، نسل، زبان، وطن، یعنی زمان و مکان کے ان تمام اختلافات کے باوجود، جس قدر مشترک سے یہ ایک قوم کے افراد قرار

پاتے ہیں، وہ اس نظریۂ حیات کی وحدت تھی جسے ان کے خدا نے عطا کیا تھا۔

(٥)

اور یہ سلسلہ اسی طرح آگے بڑھتا گیا تا آنکہ انسانیت اس دور کی حدود میں داخل ہو گئی جس میں وسائلِ رسل و رسائل

رسول کافۃ للناس

کی فراوانی اور ذرائع مواصلات کی کثرت سے زمین کی طنابیں کھینچ کر پوری نوعِ انسانی کو سمٹ سمٹا کر گویا ایک مختصر سی آبادی بن جانا تھا، اس طرح کہ کسی ایک مرکز سے اٹھی ہوئی آواز بیک وقت اکنافِ عالم تک پھیل جائے۔ اس سے پہلے حضرات انبیاء کرام خاص قوموں کی طرف مبعوث ہوتے تھے اور ان کی رسالت کا دائرۂ اثر و نفوذ ایک خاص علاقہ تک محدود ہوتا تھا۔ لیکن اب جو رسول بھیجا گیا تو اس سے کہا گیا کہ تم اعلان کر دو کہ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا (۷/۱۵۸) اے نوعِ انسان! میں تم سب کی طرف خدا کا پیغام بر بن کر آیا ہوں۔ آپ غور کیجئے کہ اس سے پہلے جو حضرات انبیاء کرام تشریف لاتے تھے، ان کے پیشِ نظر کسی ایک علاقہ میں بسنے والی ایک قوم کو، دو قوموں میں تقسیم کرنا ہوتا تھا۔ لیکن اب جو رسول آیا تو اس کا مشن یہ تھا کہ وہ تمام دنیا کے انسانوں کو دو قوموں میں تقسیم کرے۔ دنیا میں بے شمار نسلیں تھیں، سینکڑوں قومیں، ہزاروں زبانیں۔ اس رسولِ آخر الزمان کا نصب العین یہ تھا کہ وہ اس قدر کثیر النوع اختلافات و امتیازات کے باوجود، انہی انسانوں میں سے، ایک ایسی امت کی تشکیل کرے جو ان اختلافات سے بلند ہو کر صرف ایک قدرِ مشترک کی بنا پر امتِ واحدہ بن جائے۔

اس رسول کے پروگرام کی حدِ آخریں تو عالمگیر انسانیت تھی لیکن اس کا آغاز بہرحال ایک خاص خطۂ زمین

آغازِ کار

اور ایک مخصوص قوم ہی سے ہونا تھا۔ یہ قوم جو اس پیغام کی اولین مخاطب تھی، نسل پرستی میں اپنی انتہا تک پہنچی ہوئی تھی۔ ہر قبیلہ اپنے حسب اور نسب کے غلغلے بلند کرتا۔ شاعر ان کے آباء و اجداد کی حمد و ستائش کے قصیدے پڑھتے۔ میدانِ جنگ میں ہر نبرد آزما اپنے آپ کو اپنے اسلاف کے کارناموں سے متعارف کراتا۔ نسبی افتخار کا یہ عالم، بڑے قبیلے کا فرد، کسی ادنیٰ قبیلے کے فرد سے، رشتہ ناطہ تو کجا، میدانِ جنگ میں لڑنا تک گوارا نہ کرتا۔ اس قوم سے یہ کہنا کہ تمہارے ان قبائلی امتیازات کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ اس سے تم اپنا تعارف کرا لیتے ہو، ورنہ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (۴۹/۱۳) معیارِ خداوندی کی رو سے سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہے جس کا کردار سب سے بلند ہے، خواہ وہ کسی خاندان میں پیدا ہوا ہو۔ کوئی سی زبان بولتا ہو، دنیا کے کسی خطہ کا باشندہ ہو، بہت بڑا انقلابی پیغام تھا۔ یہ تھا وہ معیار جس کے مطابق ایک نئی قوم کی تعمیر کی داغ بیل ڈالی گئی۔ ان سے کہا گیا کہ یاد رکھو! دنیا میں قومیں صرف دو ہیں ——
ایک وہ جو خدا کی متعین کردہ، زندگی کی بلند اور غیر متبدل اقدار کی صداقت پر ایمان رکھے (انہیں مومن کہا جائیگا)

اور دوسری وہ جو ان انذار سے انکار کرے (انہیں کافر یعنی نہ ماننے والے، کہہ کر پکارا جائے گا) هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ۔ خدا نے تم سب کو صرف انسانوں کی حیثیت سے پیدا کیا۔ اس کے بعد فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّ مِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ۔ (۶۴/۲) تم نے اپنے آپ کو دو قوموں میں تقسیم کر لیا۔ ایک جماعت مومنین اور ایک گروہ کفار۔ اس کے علاوہ انسانوں کی کوئی اور تقسیم نہیں۔ انسان کو صاحب اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے اس لئے کوئی ایسی تفریق و تخصیص جس میں

قومیت بالارادہ

اس کے اختیار و ارادہ کو دخل نہ ہو، انسانی عمل نہیں سمجھا جائے گا۔ اگر قومیت کا معیار نسل ہے تو جو شخص کسی ایک نسل میں پیدا ہو گیا وہ اپنی نسل (لہٰذا قومیت) بدل نہیں سکتا۔ اگر معیار وطن ہے تو کسی خاص ملک میں پیدا ہو جانا بھی پیدا ہونے والے بچے کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ لیکن کفر اور ایمان ہر فرد کے اپنے اختیار و انتخاب کی چیز ہے۔ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (۱۸/۲۹) جس کا جی چاہے ایمان لا کر قوم مومنین میں شامل ہو جائے جس کا جی چاہے کفر کی روش اختیار کر کے گروہ کفار میں شامل ہو جائے۔ راستے یہ دو ہی ہیں۔ تیسرا راستہ کوئی نہیں۔ لہٰذا قومیں بھی دنیا میں دو ہی ہیں۔ ایک حزب اللہ ہے (یعنی خدا کی پارٹی) دوسری حزب الشیطان۔ (یعنی غیر از خدا کی پارٹی)۔ (۵۸/۲۲، ۱۹)

اس مقام پر میں عزیزان گرامی قدر! ایک نہایت اہم اور بنیادی نکتہ کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ایمان اور کفر یعنی ایک قسم کے نظریہ حیات اور دوسری قسم کے نظریہ کو اتنی اہمیت کیوں دے دی گئی ہے کہ ان کی رو سے انسانوں میں ایسی مستقل اور غیر متبدل حد فاصل قائم کر دی گئی جو نہ مٹائی جا

نظریہ کی اہمیت

سکتی ہے اور نہ ہی اس میں مفاہمت کی گنجائش ہے۔ انسانوں کی عملی زندگی پر اس سے بالآخر اثر کیا پڑتا ہے۔ چونکہ آج ہمارے سامنے نہ صحیح نظریۂ زندگی ہے، نہ اس نظریہ کے مطابق زندگی بسر کرنے والی کوئی قوم، اس لئے یہ بتانا اور سمجھانا واقعی مشکل ہے کہ انسان کی عملی زندگی میں نظریہ کی کیا اہمیت ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ اور ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ جو معاملہ کرتی ہے وہ اس نظریہ کے مطابق ہوتا ہے جس کا حامل وہ فرد یا وہ قوم ہوتی ہے۔ جب نظریہ یہ ہو کہ زندگی محض طبیعی زندگی ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں تو اس کی رو سے، اس قوم کا مسلک "جنگل کا قانون" ہوتا ہے۔ یعنی یہ مسلک کہ ہر طاقتور کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ کمزور کو کھا جائے۔ ایسا کرنے پر اس سے کوئی بازپرس نہیں کر سکتا۔ اس کے برعکس قرآنی نظریہ کی حامل قوم کا مسلک یہ ہوتا ہے کہ ہر طاقتور کا فریضہ ہوتا ہے کہ وہ کمزور کی حفاظت اور پرورش کرے، اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس سے اس کی بازپرس ہوگی۔ کفر کا نظریہ یہ ہے کہ اپنی قوم کی منفعت کے لئے جو کچھ کیا جائے وہ سب جائز اور درست ہوتا ہے لیکن ایمان پر مبنی نظریہ یہ ہے کہ مَا يَنْفَعُ النَّاسَ

فَيَمۡكُثُ فِي الۡاَرۡضِ (۱۳/۱۷) وہی نظریہ، وہی نظام، وہی عمل باقی رہ سکتا ہے جو کسی خاص گروہ یا خاص قوم نہیں بلکہ پوری کی پوری نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو۔ مغربی نظریۂ قومیت کا نتیجہ یہ ہے کہ جو شخص، اپنی قوم کے فائدے کے لئے دوسری قوموں کو جتنا زیادہ لوٹے وہ اتنا ہی زیادہ محبِ وطن (PATRIOT) اور واجب التکریم سمجھا جاتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کا اعتراف و اظہار، اٹلی کے مدبر (CAVOUR) نے ان الفاظ میں کیا تھا کہ

> جو کچھ ہم نے اپنی قوم اور مملکت کے لئے کیا ہے اگر وہی کچھ اپنی ذات کے لئے کریں تو کتنے بڑے شیطان کہلائیں۔

میں اس وقت صرف اتنے اشارے پر اکتفا کرتا ہوں۔ تفصیل ذرا آگے چل کر پیش خدمت کروں گا۔ مختصراً یہ کہ قرآن کی رو سے، غلط نظریۂ زندگی کی حامل قوم کی کیفیت یہ ہوتی ہے۔ اس کے برعکس صحیح نظریۂ زندگی کی بنیاد پر تشکیل شدہ قوم کی حالت یہ نہیں ہوتی۔ وہ ان قوموں سے یکسر مختلف ہوتی ہے۔ سورۃ القلم میں ہے۔ اَفَنَجۡعَلُ الۡمُسۡلِمِيۡنَ كَالۡمُجۡرِمِيۡنَ (۶۸/۳۵) کیا وہ قوم جو مستقل اقدارِ حیات کی حامل ہو، قومِ مجرمین کے مانند ہو سکتی ہے؟ مَا لَكُمۡ كَيۡفَ تَحۡكُمُوۡنَ (۶۸/۳۶) جو ایسا سمجھتے ہیں۔ یعنی یہ خیال کرتے ہیں کہ نظریۂ حیات کا قوموں کی حالت پر کچھ اثر نہیں پڑتا، وہ بہت برا فیصلہ کرتے ہیں۔ یہاں کہا گیا ہے کہ مومن اور مسلم قوم مجرم قوم جیسی نہیں ہو سکتی۔ عربی زبان میں جرم کے بنیادی معنی ہیں درخت سے پھل توڑ لینا۔ بھیڑ کی اون مونڈ لینا۔ قرآن کہتا ہے کہ صحیح نظریۂ حیات کی حامل قوم کی یہ کیفیت نہیں ہوتی کہ وہ دوسری قوموں کے درختوں کے پھل توڑ کر اپنے ہاں لے آئیں۔ اس کی روش نہیں ہوتی کہ وہ کمزور قوموں کی اون مونڈ کر انہیں سردی میں ٹھٹھرنے دے اور اپنی قوم کے افراد کے لئے حرارت و آسائش کا سامان فراہم کرلیں۔ دوسری جگہ ہے اَفَمَنۡ كَانَ مُؤۡمِنًا كَمَنۡ كَانَ فَاسِقًا لَا يَسۡتَوٗنَ (۳۲/۱۸) کیا قومِ مومن اور قومِ فاسق ایک جیسی ہو سکتی ہیں؟ قطعاً نہیں۔ وہ کبھی یکساں نہیں ہو سکتیں۔ سورہ ص میں ہے۔ اَمۡ نَجۡعَلُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالۡمُفۡسِدِيۡنَ فِي الۡاَرۡضِ ۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ صحیح نظریۂ حیات پر عمل کرنے والی قوم، اور دنیا میں فساد برپا کرنے والی قومیں برابر ہیں؟ یہ غلط ہے۔ اَمۡ نَجۡعَلُ الۡمُتَّقِيۡنَ كَالۡفُجَّارِ (۳۸/۲۸) قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرنے والی، اور ان سے الگ ہٹ کر انسانیت میں انتشار پیدا کرنے والی قوم، ایک جیسی نہیں ہو سکتی۔ دوسری جگہ ہے کہ جو لوگ انسانی معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرتے ہیں کیا وہ سمجھتے ہیں کہ وہ ان لوگوں جیسے ہو جائیں گے جو ایمان و اعمالِ صالح کے حامل ہیں؟ ان کا ایسا خیال کرنا غلط ہے۔ نہ ان دونوں کی زندگی ایک جیسی ہو سکتی ہے، نہ موت۔ جو ایسا سمجھتا ہے وہ بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہے (۴۵/۲۱)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ صحیح نظریۂ حیات پر یقین رکھنے والے لوگوں کو، دوسرے انسانوں سے الگ کرکے، خالص انہی پر مشتمل قوم کی تشکیل کا عملی مفہوم کیا ہے اور اس میں عالمگیر انسانیت کا مفاد کیا؟

دعوتِ نبویؐ

یہ تھا وہ بنیادی مقصد جس کے لئے حضور نبی اکرمؐ نے، خود اپنی قوم، اپنی نسل اور خاندان، اپنی زبان بولنے والوں، خود اسی ملک میں رہنے والوں کو پکار کر کہا کہ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ (۳۶/۵۹)۔ اب وہ دور آگیا ہے جس میں مجرم اور انسانیت دوست افراد ملے جلے نہیں رہ سکیں گے۔ یہ ایک قوم کے افراد نہیں ہوسکتے۔ اب مجرموں کو، انسانیت دوست انسانوں سے ممیز طور پر الگ ہونا پڑے گا۔ اب اسی ملک میں بسنے والے، اسی نسل سے متعلق، یہی زبان بولنے والے، انسان دو قوموں میں تقسیم ہوجائیں گے۔ ایک وہ جو مستقل اقدارِ خداوندی کو اپنا شعارِ زندگی بنا کر عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود کا علم بلند کرکے اٹھیں، اور دوسری قوم وہ جن کا مسلکِ حیات جنگل کا قانون ہو۔ اس آواز پر سعید روحیں، اپنی قوم، اپنے قبیلہ، اپنے خاندان سے چھٹ کر اور کٹ کر، الگ ہوتی گئیں، اور اس طرح ایک ہی وطن میں دو قوموں کی تشکیل کی ابتداء ہوگئی۔

نسل یا وطن کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل کے لئے کچھ کرنا ہی نہیں پڑتا۔ وہ قوم تو بنی بنائی ہوتی ہے لیکن نظریہ کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل بڑا صبر آزما اور استقامت طلب مرحلہ ہوتا ہے۔ اس کے لئے ایک ایک، فرد کے قلب و دماغ میں نفسیاتی تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے جسے قرآن کی اصطلاح میں ایمان کہتے ہیں۔ قومیت سازی کی اس مہم کو قرآن میں عملِ تزمیل سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسی جہت سے رسول اللہؐ کو

عملِ تزمیل

المزمل کہہ کر پکارا گیا ہے۔ مزمل کے معنی ہیں وہ سالارِ کارواں جو ایسے رفقاء کو تلاش اور منتخب کرے جن میں فکری اور قلبی ہم آہنگی ہو۔ مسلسل تعلیم و تربیت اس کا ذریعہ تھا۔ اس عملِ تعلیم و تزمیل سے ایک ایک کرکے اس جدید قوم کے افراد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ قرآن کے الفاظ میں وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (۲/۱۴۳)۔ اس طرح رفتہ رفتہ بتدریج ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی امت بنا دیا جس کا فریضہ زندگی یہ تھا کہ وہ تمام اقوامِ عالم کے اعمال کی نگرانی کرے، اور ان کا رسول ان کے اعمال کا نگران ہو۔ دوسری جگہ ہے كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (۳/۱۱۰)، تم ایک بہترین قوم ہو جسے نوعِ انسان کی بہبود و منفعت کے لئے کھڑا کیا گیا ہے۔ آپ نے ملاحظہ فرمالیا کہ صحیح نظریۂ حیات کی حامل قوم کا مقصدِ زندگی کیا ہوتا ہے؟

ضمناً، قرآن کریم نے جو کہا ہے کہ تمہارا رسول تم پر نگران ہو" تو اس میں ایک عظیم حقیقت مضمر ہے دنیا میں (چند ایک دھریوں کو چھوڑ کر) تمام انسان کسی نہ کسی شکل میں خدا کو مانتے ہیں، لیکن خدا کے ماننے

رسول اور امت

سے وہ ایک قوم نہیں بنتے۔ قوم بنتی ہے رسولؐ کی نسبت سے۔ مثلاً یہودی حضرت عیسیٰؑ سے پہلے کے تمام انبیاءؑ بنی اسرائیل پر ایمان رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ عیسائیوں سے الگ قوم قرار پاتے ہیں۔ جس دن ایک یہودی حضرت عیسیٰؑ کی رسالت پر ایمان لے آتا ہے، وہ اپنی سابقہ قوم سے کٹ کر عیسائی قوم کا فرد قرار پا جاتا ہے۔ اسی طرح جس دن ایک عیسائی حضرت عیسیٰؑ کے بعد ایک اور رسول (یعنی رسولِ عربیؐ) پر ایمان لے آتا ہے، وہ ملتِ عیسوی سے کٹ کر امتِ محمدیہ کا فرد قرار پا جاتا ہے۔ اس سے آپ نے دیکھا کہ امت کی تشکیل، رسول کی نسبت سے ہوتی ہے۔ اسی اصول کی بنا پر جو شخص رسول اللہؐ کے بعد کسی اور نبی پر ایمان لے آتا ہے تو وہ امتِ محمدیہؐ سے کٹ کر اس جدید نبی کی امت کا فرد بن جاتا ہے۔ اقبالؒ نے اس حقیقتِ کبریٰ کو بڑے حسین اور بصیرت افروز اسلوب میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ

حق تعالیٰ پیکرِ ما آفرید		از رسالت در تنِ ما جاں دمید
حرف بے صوت اندریں عالم بدیم		از رسالت مصرعِ موزوں شدیم
از رسالت ہم نوا گشتیم ما		ہم نفس ہم مدعا گشتیم ما
پس خدا بر ما شریعت ختم کرد		بر رسولِ ما رسالت ختم کرد

رونق از ما محفلِ ایام را
اُو رسل را ختم و ما اقوام را

نظریہ کی بنیادوں پر متشکل شدہ اس امتِ جدیدہ کی ہیئتِ ترکیبی عجیب تھی۔ حبش کا بلالؓ، فارس کا سلمانؓ، روم کا صہیبؓ، اپنوں میں سے تھا، اور خود مکہ کے رہنے والے، وہی زبان بولنے والے، اسی نسل بلکہ قبیلہ سے وابستہ، خود رسول اللہؐ کے چچا عباس اور ابولہب، دوسری قوم کے افراد تھے۔ تیرہ سال کی محنتِ شاقہ اور سعی مسلسل کے بعد ایک مختصر سی امت وجود میں آگئی تو سوال یہ سامنے آیا کہ جس نظریہ کی حامل یہ امت ہے، اسے ایک عملی نظام میں متشکل کرنے کے لئے ایک آزاد خطۂ زمین کی ضرورت ہے۔ مکہ کی فضا اس انقلاب کے لئے سازگار نہیں تھی، اس لئے کہا گیا کہ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا - (۷۳/۱۰) اب ان لوگوں سے کنارہ کش ہو جاؤ۔ لیکن یہ کنارہ کشی بھی بڑے حسین اور جمیل انداز سے ہونی چاہیئے۔ فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلَامٌ (۴۳/۸۹) ان سے الگ ہو جاؤ اور کہہ دو کہ تمہارا خدا حافظ۔ لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ۔ تم اپنے پروگرام پر عمل پیرا رہو، ہم اپنا کام کریں گے۔ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ۔ تم میں اور ہم میں کوئی جھگڑا نہیں۔ کوئی پرخاش نہیں۔ سورۂ انعام میں اس انقلابی اعلان کو ان لفظوں میں اس جامعیت کے ساتھ بیان کیا گیا

ہے کہ جوں جوں نگہِ بصیرت اس پر غور کرتی ہے، روح وجد میں آجاتی ہے۔ فرمایا۔ قُلِ اللّٰهُ — کہو اللہ — ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ (۶/۹۲) اور پھر انہیں چھوڑ دو کہ یہ زندگی سے کھیل کھیلتے رہیں۔

ہجرت

علیحدگی کے اس اعلان کے بعد یہ مختصر سی امت' مکہ سے ہجرت کر کے' مدینہ کی طرف آگئی۔ اقبالؒ نے کہا ہے کہ اسلام کے نظریہ قومیت میں' ہجرت ایک عظیم حقیقت کو واشگاف کرتی ہے۔

عقدۂ قومیتِ مسلم کشود　　　از وطن آقائے ما ہجرت نمود

حکمتش یک ملتِ گیتی نورد　　　بر اساسِ کلمہ تعمیر کرد

تا ز بخششہائے آں سلطانِ دیں　　　مسجدِ ما شد ہمہ روئے زمیں

ہجرت کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان کے نزدیک' وطن مقصود بالذات نہیں - ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اگر ایسا وقت آجائے کہ وطن کی کشش اور اس نصب العین کے قیام و استحکام میں تصادم ہو جائے' ان میں (ٹکراؤ) پڑ جائے تو مومن' وطن کی خاک سے دامن فشاں اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور ایسی سرزمین کی طرف راہ نورد ہو جاتا ہے جس کی فضا اس مقصد کے حصول کے لئے سازگار ہو۔

ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است　　　ایں ز اسبابِ ثباتِ مسلم است

معنی او از تنک آبی رم است　　　ترکِ شبنم بہرِ تسخیرِ یم است

مدینہ میں عام عرب بستے تھے، عیسائی بستے تھے، یہودی بستے تھے۔ جب مہاجرین کا یہ کارواں وہاں پہنچا ہے تو انہوں نے تمام غیر مسلموں کو چھوڑ کر صرف ان چند مسلمانوں کو اپنوں میں شامل کیا جنہوں نے انہیں یہاں آنے کی دعوت دی تھی، اور جو آج تک انصار کے درخشندہ لقب سے متعارف ہیں۔ مکہ کے قریش اسے برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ یہی امت' نسل اور وطن کی تنگ نائے سے نکل کر' عالمگیر نظریہ اخوت کی بنا پر' ایک بحرِ ناپید کنار بن جائے اس لئے انہوں نے' وہاں بھی ان کا پیچھا کیا اور ۲ھ میں' بدر کے میدان میں ان دونوں قوموں کا آمنا سامنا ہو گیا۔

بدر کا میدان

اس تقابل میں چونکہ اسلامی اور غیر اسلامی نظریۂ قومیت نکھر اور ابھر کر سامنے آگیا اس لئے قرآن کریم نے اسے یوم الفرقان کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی اس طرح نمایاں طور پر الگ الگ ہو کر سامنے آجانے کا دن جس میں کسی کو کسی قسم کا شک و شبہ یا ابہام و التباس نہ ہو۔ یہ وہ میدان تھا جس میں (جیسا کہ میں نے معراجِ انسانیت میں تفصیل سے لکھا ہے) حضرت ابوبکرؓ ایک طرف تھے اور خود ان کا بیٹا صفِ مقابل میں۔ حضرت حذیفہؓ ادھر تھے اور ان کا باپ عتبہ دوسری طرف۔ حضرت عمرؓ اس طرف تھے تو ان کا ماموں اُس طرف۔ حضرت علیؓ ادھر تھے اور ان کے بھائی عقیل اُدھر۔ نہیں! حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس طرف تھے اور آپؐ کے چچا عباسؓ اور داماد ابوالعاص دشمنوں کی صف میں۔ یہ تھی وہ تقسیمِ انسانیت جو

وطن، رنگ، نسل، زبان، رشتہ داری کے تمام حدود سے بلند ہو کر خالص ایمان اور کفر کی بنیادوں پر وجود میں آتی تھی۔ یہ تھا وہ میدان جس میں اسلام کا نظریۂ قومیت ابھر کر دنیا کے سامنے آگیا تھا۔

———— (٥) ————

تعمیر و استحکامِ قومیت کے لئے دو عناصر بنیادی اور لاینفک ہیں۔ یعنی باہمی یگانگی (GREGARIOUSNESS) اور بیرونی بیگانگی (EXCLUSIVENESS)۔ بالفاظِ دیگر، اس قوم کے افراد کی ایک دوسرے کے ساتھ گہری وابستگی، اور اپنے جداگانہ تشخص

استحکامِ خویش

کو قائم رکھنے کے لئے، دوسری اقوام سے علیحدگی۔ قرآن میں دیکھئے۔ ان دونوں گوشوں کے لئے واضح ہدایات اسی شرح و بسط سے ملتی ہیں کہ اس باب میں مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ چونکہ اسلامی قومیت کا مدار خارجی اسباب و علائق پر نہیں بلکہ نظریۂ زندگی کے اشتراک پر ہے جس کا تعلق انسانی قلب سے ہے اس لئے امتِ مسلمہ کے استحکام کے لئے افرادِ امت میں قلبی یگانگت لاینفک ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

با وطن وابستہ تقدیرِ امم	بر نسب بنیادِ تعمیرِ امم
ملتِ ما را اساسِ دیگر است	ایں اساس اندر دلِ ما مضمر است

یہی وہ احساس ہے جس کے استحکام کے سلسلہ میں قرآن کریم نے ان افرادِ امت سے کہا کہ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ۔ تم اس انعامِ خداوندی کو یاد کرو کہ كُنْتُمْ اَعْدَاۤءً تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ تم ایک ہی جگہ رہتے تھے۔ ایک ہی زبان بولتے تھے۔ ایک ہی نسل سے متعلق تھے۔ لیکن اس کے باوجود تم میں بعد و مغائرت تھی۔ فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا۔ (۳/۱۰۲) اس نے تمہارے دلوں کو ایک دوسرے کے ساتھ پیوست کر دیا۔ اور اس طرح اس نے تمہیں بھائی بھائی بنا دیا۔ یہ ہے خدا کا وہ انعامِ بے بہا جسے تمہیں ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ آپ نے غور کیا کہ قرآن کریم نے مختلف افرادِ انسانیہ کو ایک امت بنانے کے لئے بنیاد کیا بتائی ہے؟ دلوں کی ہم آہنگی، نگاہ کی یک رنگی، اور ظاہر ہے کہ یہ ہم آہنگی اور یک رنگی، نظریۂ حیات کے اشتراک ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ نسل یا وطن کے اشتراک سے تو جو قوم وجود میں آتی ہے

قلبی یگانگت

اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّ قُلُوْبُهُمْ شَتّٰى۔ (۵۹/۱۴) وہ ایک جتھہ، ایک گروہ، ایک جماعت تو نظر آتے ہیں لیکن ان کے دل ایک ایک دوسرے سے الگ الگ ہوتے ہیں۔ نظریۂ زندگی کی وحدت سے پیدا شدہ قلوب کی ہم آہنگی وہ متاعِ بے بہا ہے جس کا نہ کوئی بدل ہے اور نہ ہی ایسی اجتماعیت نظریۂ زندگی کی وحدت کے سوا کسی اور طریق سے پیدا ہو سکتی ہے۔ سورۂ انفال میں نبی اکرمؐ کو مخاطب کر کے کہا گیا کہ وَ اَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ۔ خدا نے ان کے دلوں کو باہمدگر پیوست کر دیا ہے۔ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّاۤ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ (۸/۶۳) اگر ان میں یہ وجہِ جامعیت نہ ہوتی تو ان کے قلوب میں اس قسم کی ہم آہنگی کبھی پیدا نہ ہو سکتی۔ خواہ اس کے لئے ساری دنیا کی دولت بھی کیوں نہ صرف کر دی جاتی۔ یہی وہ وجہِ یگانگت اور احساسِ قومیت ہے جس سے ان کی کیفیت یہ ہو گئی ہے کہ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۤءُ بَعْضٍ۔ (۹/۷۱) مومن مرد اور عورتیں سب ایک دوسرے کے دوست، غمخوار، بہی خواہ اور شفیق ہیں۔ نہیں! بلکہ اس سے بھی آگے اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ۔ (۴۹/۱۰) یہ سب ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ ان میں باہمی رشتہ، قومیت کا نہیں، اخوت کا ہے۔ اخوت کا ایک رشتہ ہابیل اور قابیل میں تھا،

جو خدا سے اختلاف سے اس طرح ٹوٹا کہ ایک بھائی کا خنجر دوسرے بھائی کے گلے پر تھا۔ اور اخوت کا ایک رشتہ یہ ہے جس میں کہا گیا کہ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ ..... (۴/۹۳) جس نے اپنے مومن بھائی کو عمداً قتل کیا تو وہ سیدھا جہنم میں جائے گا۔ اِن سے، واضح الفاظ میں کہہ دیا گیا کہ تم خدا کی وحدانیت پر ایمان رکھتے ہو۔ اس ایمان کا عملی ثبوت، امت کی وحدت ہے۔ اس لئے اگر تم میں تفرقہ پیدا ہو گیا تو تم مومن اور موحد نہیں رہو گے، مشرک ہو جاؤ گے۔ (۳۰/۳۱) رسول اللہ سے کہا گیا کہ یہ لوگ تمہاری نسبت سے ایک امت بنے ہیں۔ اگر انہوں نے باہمی تفرقہ پیدا کر لیا تو لَسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ (۶/۱۵۹) تیرا ان سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ جو تفرقہ اختیار کرے گا وہ کسی دوسری قوم کا فرد بن جائے گا، امتِ محمدیہ کا فرد نہیں رہے گا۔

افرادِ امت سے یہ کہا، اور دوسری طرف، مرکزِ امت، حضور نبی اکرمؐ سے کہا کہ ان افراد کی معیت بڑی گراں بہا ہے۔ جس نظام کے آپ داعی ہیں اس کا قیام و استحکام انہی کی رفاقت پر موقوف ہے۔ یاد رکھو! يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (۸/۶۴)۔ تمہارے مشن کی کامیابی کے لئے، خدا کی نصرت اور جماعتِ مومنین کی رفاقت، دونوں کی ضرورت ہے۔ انہیں کم نگہی سے نہ دیکھو۔ (۱۵/۸۸) ان سے اعراض نہ برتو (۱۸/۲۸) انہیں اپنی عاطفت اور ملاطفت کے سائے کے نیچے رکھو (۱۵/۸۸ ، ۲۶/۲۱۵) ان سے معاملات میں مشورہ کیا کرو (۳/۱۵۹) دوسری طرف، ان افرادِ امت سے تاکید کی کہ تم اس رسولؐ کے دست و بازو بنو (۸/۶۲) اپنے اختلافی معاملات میں اسے حکم قرار دو، اور اس کے فیصلے کے سامنے اس طرح سرِ تسلیم خم کرو کہ اس سے تمہارے دل میں بھی کسی قسم کی گرانی یا کبیدگی پیدا نہ ہو (۴/۶۵) حتیٰ کہ اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ۔ (۳۳/۶) تم اسے خود اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھو اس لئے کہ تمہاری ملی ہستی اسی مرکز سے قائم ہے۔

یہ تو تھی (GREGARIOUSNESS) باخویش پیوستگی کی شکل۔ جہاں تک (EXCLUSIVENESS) کا،

کفار کے ساتھ تعلقات

دوسروں سے علیحدگی کا تعلق تھا، قرآن کریم نے نہایت واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ عدل و انصاف، اور احسان و مروت کا سلوک تو دنیا کے ہر انسان سے کیا جائے گا لیکن تم اپنی ملت سے باہر کسی سے دوستداری کے تعلقات استوار نہیں کر سکتے۔ لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (۳/۲۸) جو ایسا کرے گا اسے خدا سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ وہ اس امت کا فرد ہی نہیں رہے گا۔ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ (۵/۵۱) جو ان سے دوستانہ تعلقات استوار کرے گا اس کا شمار انہی میں ہو جائے گا۔ یہی نہیں بلکہ ان سے یہ بھی کہا گیا کہ تم اپنوں کے سوا کسی اور کو اپنے رازوں میں شریک نہ کرو۔ وہ تمہارے رازوں سے واقف ہو جائیں گے تو تمہاری تباہی اور بربادی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ (۳/۱۱۸) ان افرادِ امت کا اس ارشادِ خداوندی پر کس شدت سے عمل تھا، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب مملکت کا کاروبار پھیلا تو ایک اکاؤنٹنٹ کی ضرورت پڑی۔ عربوں میں اکاؤنٹنٹ کہاں سے مل سکتا تھا، جس قوم کی زبان میں ہزار سے اوپر عدد کے لئے کوئی لفظ ہی نہ ہو، اس کے ہاں لاکھوں کروڑوں کا حساب و کتاب رکھنے والے ماہرین کیسے پیدا ہو سکتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے ہاں وثیق نامی ایک رومی عیسائی غلام تھا جو اس فن کا ماہر تھا۔ جب بہ تلاشِ بسیار ایسا آدمی مسلمانوں میں نہ مل سکا تو بعض لوگوں نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ آپ وثیق کے سپرد یہ کام کیوں نہیں کر دیتے۔ آپ نے کہا،

کہ میں جانتا ہوں کہ وہ اس فریضہ کو بخوبی سرانجام دے سکتا ہے۔ لیکن خدا کا ارشاد ہے کہ کسی غیر مسلم کو اپنا رازداں نہ بناؤ۔ اس لئے میں اسے شریکِ راز کس طرح کر سکتا ہوں۔ نہ ہی میں اسے اسلام لانے پر مجبور کر سکتا ہوں۔ اگر وہ بطیب خاطر مسلمان ہو جائے تو اور بات ہے ورنہ اس حالت میں تو اُسے رموزِ مملکت میں شریک نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ نہ وہ بطیب خاطر اسلام لایا، نہ اسے اسلام لانے پر مجبور کیا گیا اور نہ ہی اس کے سپرد یہ فریضہ کیا گیا۔

یوں عزیزانِ من! ایک ایسی امت (قوم) کی تشکیل ہوئی جس کی بنیاد نظریاتی تھی۔ یعنی جس کی کیفیت یہ تھی کہ ایک شخص دنیا کے کسی ملک کا باشندہ ہو، کسی نسل سے متعلق ہو، کوئی سی زبان بولتا ہو۔ جونہی اس نے قرآن کے عطا کردہ نظریۂ زندگی کو صداقت کو تسلیم کر لیا، وہ اس امت کا فرد بن گیا۔ اس کے برعکس ایک شخص جو اسی ملک بلکہ اسی شہر کا رہنے والا ہو، وہی زبان بولتا ہو، اسی نسل سے وابستہ ہو، لیکن اس نظریہ کا قائل نہ ہو، اسے دوسری قوم کا فرد شمار کیا گیا۔ یوں پوری نوعِ انسان دو گروہوں یا دو قوموں میں بٹ گئی۔ ساری دنیا کے مسلمان ایک قوم کے افراد، اور غیر مسلم، دوسری قوم کے افراد۔ اور ان کے تعلقات کی نوعیت یہ کہ أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ۔ (۴۸/۲۹)

جیسا کہ واضح ہو چکا ہے اس امت کی بنیاد نظریۂ زندگی کی وحدت پر تھی۔ لیکن نظریہ (آئیڈیالوجی) ایک غیر محسوس غیر مرئی

مرکزِ محسوس

(ABSTRACT) حقیقت ہوتی ہے۔ اسے ہر وقت پیشِ نظر رکھنے کے لئے کسی محسوس علامت (SYMBOL) کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس مقصد کے لئے کعبہ کو بطور مرکزی علامت تجویز کیا گیا اور اسی جہت سے اسے قبلہ قرار دیا گیا۔ قبلہ کے معنی ہیں وہ شے جو آنکھوں کے سامنے رہے۔ ان سے کہا گیا کہ وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا۔ ہر قوم نے اپنے لئے ایک نصب العین، ایک (GOAL) تجویز کر رکھا ہوتا ہے جسے وہ اپنی توجہات کا مرکز اور نقطہ ماسکہ سمجھتی ہے۔ تمہارے لئے اس قسم کا مرکز کعبہ کو مقرر کیا جاتا ہے حَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ (۲/۱۴۴) تم دنیا میں کہیں بھی ہو اپنی توجہات کا مرکز اسی کو قرار دو، اور اپنی نگاہوں کا رُخ اسی کی طرف رکھو لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۔ (۲/۱۵۰) اس سے ہوگا یہ کہ تم کہیں بھی ہوگے، ساری دنیا جان لے گی کہ تم کس قوم کے فرد ہو اور تمہارا مرکزِ اجتماعیت کونسا ہے۔ یہ تھا وہ مقصد جس کے لئے کعبہ کو قبلہ (مرکزِ توجہاتِ امت) وجہِ تعارف اور علامتِ انفرادیت مقرر کیا گیا۔ سمجھنے کے لئے یوں سمجھئے کہ آج جب ہم ماسکو، یا پیکنگ، یا واشنگٹن کہتے ہیں تو اس سے مراد یہ شہر نہیں ہوتے، اس سے مراد وہ آئیڈیالوجی، وہ نظام، وہ پالیسی ہے جس کے مراکز یہ شہر ہیں۔ یہی حیثیت اسلام میں کعبہ کی تھی۔

متمثا! غور کیجئے کہ جب دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس میں کس قدر بنیادی تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ اس وقت

اب کعبہ کی حیثیت

دین کی علامات تو ویسے ہی رہتی ہیں لیکن ان کا مفہوم و مقصود بالکل بدل جاتا ہے۔ آج کعبہ بھی بجنسہٖ موجود ہے بلکہ اس کی شان و شوکت اور آرائش و زیبائش پہلے سے بھی کہیں زیادہ ہے اور ہم اسے اپنا قبلہ بھی کہتے ہیں۔ لیکن اس سے مقصود فقط اتنا رہ گیا ہے کہ مسجدوں کی سمت اس کے مطابق متعین کی جائے اور نماز میں اپنا رُخ اس کی طرف کر لیا جائے۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد جب اس مملکت کو اسلامی بنانے کا جذبہ ابھرا تو قوم کی طرف سے پہلا مطالبہ یہ پیش کیا گیا تھا کہ ریلوے اسٹیشنوں پر ایسے نشانات نصب کئے جائیں جن سے قبلہ کی سمت متعین ہو جائے۔ جب وہاں اس قسم کے تیر کے نشانات نصب کر دیئے گئے تو قوم مطمئن ہو گئی کہ تعینِ قبلہ کا مقصد پورا ہو گیا ہے اور مملکت اسلامی بن گئی ہے۔

اور آگے بڑھیئے۔ قوم اب بھی ہر سال لاکھوں کی تعداد میں کعبہ کے گرد (حج کے لئے) جمع ہوتی ہے۔ وہاں لباس کا امتیاز مٹا دینے کے لئے احرام بھی باندھا جاتا ہے۔ بڑے خشوع وخضوع سے مناسکِ حج ادا کئے جاتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ میدانِ عرفات میں امت ایک جگہ جمع ہے۔ لیکن یہ امت، امتِ واحدہ نہیں۔ یہ مختلف قوموں میں بٹی ہوئی ہے اور ہر قوم اس جگہ بھی اپنا اپنا الگ قومی امتیاز قائم رکھے ہوئے ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ نتیجہ اس کا یہ کہ حاجی حج میں مصروف ہوتے ہیں اور ان کی قومیں ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہی ہوتی ہیں۔ یہ نتیجہ ہوتا ہے دین کے مذہب میں بدل جانے کا۔

یک رنگیٔ امت

بہرحال حضور نبی اکرمؐ نے نظریہ کی وحدت کی بنا پر ایک امت کی تشکیل فرمائی جس میں دنیا کی ہر نسل اور ہر وطن کے افراد شامل تھے۔ لیکن ان کے نسلی، خاندانی، لسانی، وطنی سب امتیازات ختم ہو گئے تھے۔ ان پر صبغۃ اللہ خدا کا رنگ اس طرح غالب آ گیا تھا کہ انسانوں کے خود ساختہ رنگوں کا کوئی نشان باقی نہیں رہا تھا۔ ایک نظریۂ زندگی پر ایمان سے یک رنگی کا یہ عالم ہے کہ

چیست ملت ایکہ گوئی لا الٰہ — با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ

اور ایک مرکزِ محسوس کے نقطۂ ماسکہ قرار پا جانے سے یہ حالت کہ اس امت کا ایک فرد دنیا کے کسی حصے میں ہو اور زندگی کے کسی شعبے میں، اس کا مرکزِ توجہ وہی نقطہ تھا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں، اس امت کے ہر فرد کی کیفیت یہ تھی کہ

پرد در وسعتِ گردوں یگانہ — نگاہ او بہ شاخِ آشیانہ

اس پرندے کی سی کیفیت جو فضا کی پہنائیوں میں اڑتا چلا جاتا ہے لیکن آشیانے کی شاخ اس کی نگاہوں سے کبھی اوجھل نہیں ہوتی۔ وہ ہر شام اس کی طرف لوٹ کر آ جاتا ہے۔

اس قوم سے کہا گیا تھا کہ

(۱) وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا (۳/۱۰۳)۔ خدا کی کتاب قرآن مجید تمہارے لئے وجہِ جمعیت ہے۔ اسے اپنی زندگی کا ضابطہ قرار دینا اور اس سے ذرا ادھر ادھر نہ ہٹنا۔

(۲) تمہارے نظام کے مرکز کا فیصلہ ہر معاملہ میں قولِ فیصل اور حرفِ آخر کی حیثیت رکھے گا۔ اگر کسی بات میں کبھی اختلاف ہو جائے تو فَرُدُّوهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُولِ (۴/۵۹) اسے اس مرکز کی طرف (REFER) کر کے وہاں سے فیصلہ لے لینا اور اس فیصلہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا۔

(۳) کعبہ تمہارا مرکزِ محسوس اور تمہاری نظریاتی وحدت کی علامت ہے۔ اس کی اس حیثیت کو نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دینا۔

(۴) اَمْرُهُمْ شُورٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) اپنے معاملات آپس میں مشورہ سے طے کر لیا کرنا اور کسی غیر کو ان میں دخل انداز ہونے دینا۔ کوئی غیر مسلم نہ تمہاری قوم کا فرد قرار پا سکتا ہے، نہ شریکِ حکومت ہو سکتا ہے۔

(۵) امت کی وحدت کو قائم رکھنا اور مختلف فرقوں، پارٹیوں اور قوموں میں نہ بٹ جانا۔ یہ شرک ہوگا (۳۰/۳۲)۔ ہمیشہ امت کے ساتھ رہنا، اپنے لئے کوئی الگ راہ تجویز نہ کر لینا۔ (وَمَن) يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّى۔ جو کسی الگ راستے پر چل نکلے گا، تو اس کا شمار امتِ مسلمہ میں نہیں ہوگا۔ اس قوم میں ہوگا جس کا راستہ اس نے اختیار کر لیا تھا۔

ان اصولوں کے مطابق جو قوم وجود میں آئی اس کی عملی شکل آسمان کی آنکھ نے حجۃ الوداع کے اجتماع میں دیکھ لی۔ اس دن عرفات کے میدان میں، کوئی ایک لاکھ کے قریب ایسے افراد جمع تھے جن کی نسلیں مختلف، قبیلے مختلف، زبانیں

مختلف، وطن مختلف تھے لیکن ان تمام اختلافات کو مٹا کر وہ صرف امتِ مسلمہ کے افراد تھے۔ یہی تھی نظریہ کے اشتراک کی بنا پر قائم شدہ وہ بے مثال امت جسے دیکھ کر حضور نبی اکرمؐ نے والہانہ انداز میں فرمایا تھا کہ

رنگ، نسل، زبان، خون، وطن کے تمام اختلافات آج ہمارے قدموں کے نیچے پامال ہیں۔

قطرے کے جذبِ دریا ہو کر عین دریا ہو جانے کی یہی وہ رقص انگیز عشرت[1] تھی جس سے سرشار ہو کر حضرت سلمانؓ نے اپنا تعارف اپنے والد کی طرف نسبت کرنے کے بجائے "سلمان بن اسلام" کہہ کر کرایا تھا۔ اقبالؒ نے اس امت کو شہد کے چھتے سے تشبیہ دے کر کہا ہے کہ اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

قطرۂ از لالۂ حمراستے　　قطرۂ از نرگسِ شہلاستے

لیکن جب

ایں نمی گوید کہ من از عبہرم　　آں نمی گوید من از نیلوفرم

وہاں حالت یہ ہوتی ہے کہ

تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

اس قسم کی امت کی تشکیل کے بعد حضورؐ کا فریضۂ رسالت مکمل ہو گیا اور آپؐ اس دنیا سے عالمِ بالا کی طرف تشریف لے گئے۔

بروحِ اعظمِ و پاکش درودِ لامحدود

(۰)

رسول اللہؐ کے بعد

حضورؐ کے بعد اسلام دنیا کے دور دراز گوشوں تک پھیلا۔ مختلف نسلوں اور قوموں کے افراد اس دین کے حلقہ بگوش ہوئے۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنی سابقہ نسلی، قومی اور وطنی نسبتوں کو مٹا کر امتِ مسلمہ کے افراد بن گئے۔ اسی طرح اسلامی مملکت بھی مختلف ممالک تک پھیل گئی۔ انتظامی سہولتوں کے پیشِ نظر ان ملکوں میں ولایات (صوبے) قائم کئے گئے لیکن مرکز ایک ہی رہا۔ نہ کسی ولایت کے مسلمانوں نے اپنے آپ کو الگ قوم کہا، اور نہ ہی کسی نے صوبجاتی خود مختاری (پراونشل اٹانومی) کا مطالبہ کیا۔ صوبجاتی خود مختاری تو ایک طرف حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں عرب کے ایک قبیلہ نے یہ چاہا کہ مملکتی ٹیکس (زکوٰۃ) کا جو روپیہ مرکزی حکومت کو جانا چاہیئے، اُسے وہ اپنی صوابدید کے مطابق

مخالفینِ زکوٰۃ

اپنے علاقہ کی فلاح و بہبود کے کاموں پر خرچ کر لیا کریں۔ ان کے اس خیال کو بغاوت قرار دیا گیا اور انہیں الٹی میٹم دے دیا گیا کہ اگر وہ اس خیال سے باز نہ آئے تو ان کے خلاف فوج کشی کی جائے گی۔

اس میں شبہ نہیں کہ کچھ عرصہ کے بعد اسلامی نظام میں کمزوری واقع ہو گئی اور مختلف علاقوں میں مختلف مملکتیں بھی قائم ہو گئیں لیکن اس کے باوجود کسی علاقہ کے مسلمانوں نے اپنے آپ کو امتِ مسلمہ سے الگ کوئی قوم قرار نہیں دیا جہاں تک مرکزیت کا تعلق ہے اس قدیم (اسلامی) تصور کا اتنا اثر باقی تھا کہ بغداد تباہ ہو چکا تھا، عباسی سلطنت (یوں کہیئے کہ) ختم ہو گئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود محمود غزنوی جیسے سلاطین خلیفہ سے سندِ بادشاہت حاصل کیا کرتے تھے اور ان کی مملکتوں میں خطبہ میں نام بھی خلیفہ ہی کا لیا جاتا تھا۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ سلطان محمد تغلق نے کس طرح خلیفہ ابوالعباس سے (جو اس وقت یوں کہیئے گویا مصر میں ایک پناہ گزین کی حیثیت سے رہتا تھا) اپنے لئے حکمرانی کا اجازت نامہ حاصل کیا اور خلیفہ نے جس سفیر شیخ الشیوخ

---

[1] عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا۔ (غالبؔ)

رکن الدین) کے ہاتھوں یہ اجازت نامہ بھیجا' بادشاہ نے اسے کس قدر انعام و تحائف سے نوازا۔ مختلف ممالک کے مسلمان بادشاہوں کی یہی عقیدت، خلافتِ عثمانیہ کے ساتھ بھی وابستہ رہی' اور جب تک وہ خلافت قائم رہی، مسلمانوں کی (کم از کم) ذہنی وابستگی اس مرکز کے ساتھ علیٰ حالہٖ رہی۔

(۰)

اب ایک قدم آگے بڑھیئے۔ عیسائیت کی حیثیت اگرچہ ایک مذہب کی تھی' دین کی نہیں تھی، لیکن اس کے باوجود عقیدہ

نظریۂ وطنیت

کا اشتراک دنیائے عیسائیت میں بھی ذہنی ہم آہنگی کا موجب ضرور تھا۔ جب یورپ نے مذہب کو سیاست سے الگ کیا' تو انہیں قومیت کے لئے کسی جدید اساس کی تلاش ہوئی۔ ظاہر ہے کہ جب انسانی زندگی سے نظریہ کے اشتراک کو الگ کر دیا جائے تو پھر وجہِ جامعیت نسلی یا وطنی اشتراک ہی رہ جاتا ہے۔ یورپ میں جن علاقوں میں کسی ایک نسل کے لوگ آباد تھے' وہاں اشتراکِ نسل قومیت کی اساس بن گیا۔ لیکن یہ صورت خال خال تھی۔ بیشتر ممالک ایسے تھے جہاں مختلف نسلوں کے لوگ آباد تھے۔ ان ممالک میں وطن کا اشتراک' قومیت کی اساس قرار پا گیا۔ یعنی ایک ملک میں بسنے والے تمام لوگ' ایک قوم کے افراد خواہ ان کا مذہب کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اس طرح وطن کی حیثیت محض عزیز قوم کی دریں بلکہ یہ ایک مخصوص سیاسی تصور کا حامل بن گیا۔ اس کے ساتھ ہی جمہوری نظامِ حکومت کے نظریہ کو بھی فروغ حاصل ہوتا چلا گیا اور وطنیت اور جمہوریت کی یہ وبا' جنگل کی آگ کی طرح ساری دنیا میں پھیل گئی اور مسلمانوں کے ملک بھی اس کی لپیٹ میں آتے چلے گئے۔

اقبالؒ جب یورپ گیا ہے تو وہ ایک تیس سالہ طالب علم تھا۔ لیکن فطرت کی کرم گستری نے اسے ایسی مفکرانہ بصیرت عطا

اقبالؒ کا احتجاج

کی تھی کہ اس نے وہاں وطنیت کی اس تحریک کا گہری نظروں سے مطالعہ کیا جس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس سے اسلام اپنی جڑ بنیاد سے اکھڑ جائیگا۔ ایک ملک میں بسنے والے مسلمان اور غیر مسلم' ایک قوم کے افراد' اور دو ہمسایہ ملکوں میں رہنے والے مسلمان' دو الگ الگ قوموں کے افراد —— اسلام نہیں کفر تھا۔ توحید نہیں شرک تھا۔ اسلام نے انسانوں میں وجہِ جامعیت خدا (یعنی خدا کے عطا کردہ نظریۂ حیات) کو قرار دیا تھا۔ لیکن وطنیت کی اس تحریک کی رو سے' وجہِ جامعیت وطن قرار پا جاتی تھی۔ اس طرح' وطن نے خدا کی پوزیشن حاصل کر لی تھی۔ چنانچہ جب اقبالؒ وہاں سے واپس آیا تو اس نے اس تصورِ قومیت کے خلاف آواز بلند کی اور مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ اس سے وہ کس طرح اسلام سے برگشتہ ہو جائیں گے۔ اس نے مومنانہ فراست اور قلندرانہ جرأت کے ساتھ للکارا کہ ؎

اس دور میں مے اور ہے' جام اور ہے جم اور　　ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور　　تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

آپ ان الفاظ پر دوبارہ غور کیجئے کہ —— مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور —— اور دیکھئے کہ ان میں کس قدر عمیق حقیقت کو کیسے سادہ انداز میں واشگاف کیا گیا ہے۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ کعبہ' امتِ مسلمہ کے لئے "مرکزِ محسوس" یا انکی وحدت کی علامت ہے۔ لیکن جب وطن کو قومیت کی اساس قرار دے دیا جائے تو اس کا عملی مفہوم اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ ہر ملک

میں بسنے والے مسلمانوں کا حرم الگ الگ قرار پا جائیگا۔ حضرت علامہؒ نے ارمغانِ حجاز میں کہا ہے کہ

حرم جز قبلۂ قلب و نظر نیست — طوافِ او طوافِ بام و در نیست
میانِ ما و بیت اللہ رمز یست — کہ جبریل امیں را ہم خبر نیست

وہ بالِ جبریل میں کہتے ہیں کہ

عرب کے سوز میں سازِ عجم ہے — حرم کا راز توحیدِ اُمم ہے
تہی وحدت سے ہے اندیشۂ غرب — کہ تہذیبِ فرنگی بے حرم ہے

جب عالمگیر انسانیت کو وطنیت کی بنیادوں پر تقسیم کر دیا جائے تو پھر انسانوں میں وحدت پیدا کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں رہتا۔ یہ ہے وہ بنیادی وجہ جس کی بنا پر اقبالؒ نے وطن کو مغرب کا تخلیق کردہ خدا قرار دیا اور مسلمانوں سے پکار کر کہا کہ

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے — غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے — اسلام ترا دیں ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے!
اے مصطفوی! خاک میں اس بت کو ملا دے

اس لئے کہ

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

ہندو کیطرف سے مخالفت

اقبالؒ نے مسلمانوں کو اس خطرہ سے آگاہ کیا اور ہندو نے اس کی سب سے زیادہ مخالفت کی۔ بظاہر سمجھ میں نہیں آسکتا کہ وطنیت کا یہ نظریہ مغرب کا پیدا کردہ ہے اور اقبال مسلمانوں کو اس کے مضمرات سے آگاہ کر رہا ہے، تو ہندو پر کیا بنی تھی کہ وہ اس کی مخالفت میں سب سے پیش پیش ہوتا؟ ہندو پر واقعی اس سے کچھ بن گئی تھی جو وہ یوں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس سے پیشتر ہندوستان میں جتنی قومیں باہر سے آئیں، ہندو نے انہیں اپنے اندر جذب کر لیا، لیکن مسلمان ایسی سخت ہڈی کا واقع ہوا تھا کہ ہندو کی ہزار کوششوں کے باوجود اس نے اپنا جداگانہ تشخص قائم رکھا۔ ہندو کی کوٹلیا "سیاست نے اندازہ لگا لیا کہ وطنیت کی تحریک میں ایسا سحر ہے جس سے وہ مسلمانوں کو اپنے اندر نہایت آسانی سے جذب کر لے گا — ہندوستان کے تمام باشندے بلا لحاظ مذہب و ملت، ایک قوم کے افراد اور اس قوم کا نظام حکومت، جمہوریت، جس میں ہندو مستقل طور پر اکثریت میں، لہٰذا اقتدار کا مالک، اور مسلمان ابدی طور پر اقلیت میں، لہٰذا محکوم۔ یہ تھا ہندو کا وہ خواب جو اقبال کی للکار سے پریشان ہو رہا تھا۔ اس سے سمجھ میں آجاتے گا کہ ہندو، اقبال کے اس پیغام سے وقتِ اضطراب کیوں تھا۔ بہرحال ہندو کی اس مخالفت کے باوجود، اقبال نے اپنے پیغام کو جاری رکھا۔ وہ قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو بالخصوص مخاطب کر کے کہتا تھا کہ

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار — قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تاآنکہ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیان، یہ حقیقت زیادہ وضاحت سے سامنے آنے لگ گئی کہ انگریز ہندوستان سے چلا جائے گا اور یہاں کی حکومت اہلِ ہند کے ہاتھ میں آجائے گی۔ اس سے اقبالؒ نے اپنے پیغام کو اور بھی زیادہ قوت اور شدت سے پیش کرنا شروع کر دیا، اور اسی نسبت سے ہندو کی مخالفت بھی تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی۔

نیشنلسٹ علماء

ہندو کی مخالفت قابلِ فہم تھی لیکن جب اقبالؒ نے دیکھا کہ خود مسلمانوں کے ایک طبقے نے بھی اس باب میں ہندو کی ہمنوائی شروع کر دی ہے تو اس کا قلبِ حساس خون بن کر آنکھوں سے ٹپک پڑا۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر جب اس نے دیکھا کہ مسلمانوں کے اس طبقہ کی قیادت، خود مسلمانوں کے مذہبی پیشواؤں ـــ نیشنلسٹ علماء ـــ کی طرف سے ہو رہی ہے، تو اس پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ جب مارچ ۱۹۳۸ء میں، (مولانا) حسین احمد مدنی نے کہا کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" تو اقبالؒ بسترِ مرگ پر پڑا تھا۔ اس اعلان سے اس کے قلبِ مضطر سے ایک چیخ ابھری اور ان الفاظ کی شکل میں فضائے عالم کو چیر گئی کہ

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں، ورنہ زدیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

سرود برسرِ منبر کہ ملت از وطن است چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است

بہ مصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر باو نرسیدی، تمام بولہبی است

"بمصطفےٰ برساں خویش را" کے الفاظ پر غور کیجئے، ایک عظیم حقیقت آپ کے سامنے بے نقاب ہو گی۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، کہ اسلام کی رو سے، قوم کی تشکیل رسولؐ کی نسبت سے ہوتی ہے۔ اگر قومیت کی اساس، وطن قرار پا جائے تو رسولؐ سے نسبت ختم ہو جاتی ہے۔ اسی بنا پر، وہ (مولانا) مدنی سے کہتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل کے لئے اپنی نسبت وطن کی طرف کرنے کے بجائے رسولِ پاکؐ کی طرف کرو ـــ یہی دین کی اصل و اساس ہے۔ اسی بنا پر حضرت علامہؒ نے اپنے اس بیان میں، جسے انہوں نے (مولانا) مدنی کے جواب میں ارشاد فرمایا تھا، اس امر کی تصریح کی تھی کہ وطنیت کا عقیدہ اور انکارِ ختمِ نبوت، اپنے نتیجہ کے اعتبار سے ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں۔ ان دونوں میں، مسلم قومیت کی اساس رسالتِ محمدیہ نہیں رہتی اور جب مسلم قومیت کی اساس رسالتِ محمدیہ نہ رہے تو پھر اسلام بھی باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ انہوں نے، اس نقطہ کی وضاحت کے لئے لکھا تھا کہ

> اگر بعض مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ "دین" اور "وطن" بحیثیت ایک سیاسی تصور کے یکجا رہ سکتے ہیں تو میں مسلمانوں کو بروقت انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ اول تو لادینی ہو گی، اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے بے پروائی۔

یہ اقبالؒ کے آخری الفاظ تھے۔ اس کے بعد انہوں نے اس شمع کو قائداعظمؒ جیسے امین کے ہاتھوں میں دیا اور خود زندگی

قائداعظمؒ

کی اگلی وادیوں کی طرف تشریف لے گئے۔ قائداعظمؒ کے مدِمقابل خود (مہاتما) گاندھی تھا، کیونکہ انہوں نے نیشنلسٹ علماء کو (SHOW-BOYS OF CONGRESS) کہہ کر جھٹکا دیا تھا۔ گاندھی اور جناح کی اس جنگ کا مرکزی محاذ مسئلہ قومیت ہی تھا، کہ یہی مسئلہ درحقیقت بساطِ سیاست پر فیصلہ کن مہرہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ مسٹر گاندھی کا دعویٰ تھا کہ

میں تاریخ میں اس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ جنہوں نے اپنے آباد و اجداد کا مذہب چھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو' وہ اور ان کی اولاد یہ دعوےٰ کریں کہ وہ اپنے آباد و اجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں۔ اگر ہندوستان' اسلام کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا تو اسلام کے بعد بھی اسے ایک ہی قوم رہنا چاہیئے خواہ اس کے سپوتوں میں سے ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو۔

(جناح کے نام خط۔ مورخہ ۱۵ ۹/۴۴)

قائداعظمؒ کی طرف سے اس کا جواب یہ تھا کہ :-

پاکستان کی ابتداء تو اسی دن سے ہو گئی تھی جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم مسلمان ہوا تھا کیونکہ اس سے ایک جداگانہ قوم کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ (علیگڑھ کی تقریر۔ مارچ ۱۹۴۴ء)

اور اس حقیقت کو انہوں نے بار بار واضح کر دیا تھا کہ ہمارے اس دعویٰ کا جذبۂ محرکہ کسی سیاسی مقصد کا حصول نہیں۔ یہ اسلام کا بنیادی تقاضا ہے۔ یہ ہمارے دین کا مطالبہ ہے جسے' مسلمان ہونے کی حیثیت سے' ہم کسی حالت میں بھی نہیں چھوڑ سکتے۔ دین کی کتنی بڑی بنیادی حقیقت مضمر تھی قائداعظمؒ کے ان الفاظ میں کہ مسلم قومیت کا آغاز تو اسی دن سے ہو جاتا ہے جب کسی ملک میں پہلا غیر مسلم' اسلام قبول کر لیتا ہے۔ وہ شخص' اسلام لانے سے اپنی پہلی قوم کا فرد نہیں رہتا' خواہ اس قوم کی بنیاد نسل کا اشتراک ہو اور خواہ وطن کا۔ وہ ان سب نسبتوں سے کٹ کر اپنی نسبت رسالتِ محمدیہؐ سے وابستہ کر لیتا ہے اور اسی نسبت سے وہ امتِ محمدیہ کا فرد بن جاتا ہے۔ یہی تھا ہمارے دین کا وہ تقاضا جس کی بنا پر ہم نے پاکستان حاصل کیا تھا۔ یعنی ساری دنیا میں بسنے والے مسلمان' ایک قوم (امت) کے افراد اور خود اپنے ملک میں رہنے والے غیر مسلم' دوسری جماعت کے افراد۔

(٠)

میں' برادرانِ عزیز! پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اگر قومیت کی اساس نسل یا وطن تسلیم کر لی جائے تو تشکیلِ قومیت کیلئے کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ ہر بچہ جو اس خاص نسل میں' یا اس وطن کی حدود کے اندر پیدا ہوتا ہے' وہ از خود اس قوم کا فرد بن جاتا ہے۔ لیکن جب قومیت کی اساس نظریۂ زندگی قرار پائے' تو اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ بچوں کے دل میں اس نظریہ کو راسخ کیا جائے' اور اس عمل کو مسلسل جاری رکھا جائے کیونکہ بچوں کی پیدائش کا سلسلہ متواتر جاری رہتا ہے۔ جب قرآنِ کریم نے حضور نبی اکرمؐ کا فریضۂ زندگی یہ بتایا کہ یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَۃَ۔ کہ وہ کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے تو اس سے اس حقیقت کا انکشاف مقصود تھا کہ کوئی بچہ کسی نظریہ کو ساتھ لے کر دنیا میں نہیں آتا۔ آپ جس نظریہ کا حامل اپنی قوم کو بنانا چاہتے ہیں' مسلسل تعلیم و تربیت سے اس نظریہ کو بچوں کے قلب و دماغ کی گہرائیوں میں پیوست کرتے جایئے۔

ہماری غفلت

میں نے' عزیزانِ من! جب تحریکِ پاکستان کے دوران نیشنلسٹ علماء سے مسئلہ قومیت پر جنگ لڑی تو میں نے دیکھا کہ ان لوگوں کو اس میدان میں شکست دے دینا چنداں مشکل نہیں تھا کیونکہ ان سے مقابلہ سند اور دلیل کی رُو سے ہوتا تھا' لیکن (میں نے محسوس کیا) کہ قوم کے نوجوانوں کو دین کی بنیادوں پر اس نظریہ کا سمجھانا نسبتاً مشکل تھا کیونکہ دین کی تعلیم انہیں حاصل نہیں تھی اور مغربی نظریۂ قومیت اور جمہوریت ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا۔ یہ تھے وہ اسباب و وجوہ جن کی بنا پر میں نے تشکیلِ پاکستان کے فوری بعد' اربابِ قوم سے یہ کہنا شروع کیا کہ وہ آنے والی نسلوں کی صحیح تعلیم و تربیت کا انتظام کریں' کیونکہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ان نوجوانوں کے سامنے دین کے نظریات

آئے گے ہیں؛ اور مغربی نظریات ان کے دل و دماغ پر چھا جاتیں گے۔ اس سے وہ بنیادیں متزلزل ہو جائیں گی جن پر پاکستان کی جداگانہ مملکت کی عمارت استوار ہوئی ہے۔ میں نے تیئیس سال تک مسلسل اس پکار کو جاری رکھا لیکن افسوس ہی نہیں انتہائی صدمہ ہے کہ کسی نے اس پر کان نہ دھرا۔ میں نے بڑے سے بڑے ذمہ دار حلقوں تک اس آواز کو براہ راست پہنچایا۔ کوئی اس کی افادیت اور اہمیت سے انکار نہیں کرتا تھا لیکن اس کے باوجود کسی نے اس کے لئے کوئی عملی قدم نہ اٹھایا۔ نتیجہ اس کا ظاہر ہے۔ آج آپ جسے پاکستانی قوم کہتے ہیں، یہ درحقیقت وہی بچے ہیں جو یا تو تشکیل پاکستان کے وقت دو چار دس برس کے تھے، اور یا اس کے بعد پیدا ہوئے۔ ان میں سے کسی کو آپ نے اسلام کے نظریہ قومیت کی تعلیم نہیں دی۔ اور جب آپ نے انہیں اس کی تعلیم نہیں دی تو اس تعلیم کی عدم موجودگی میں یا تو نسلی وابستگی قومیت کی اساس قرار پائے گی، اور یا وطنیت کا اشتراک۔ آپ نے تو انہیں اسلام کے نظریاتِ حیات کی تعلیم نہ دی لیکن مشرقی پاکستان میں ہندو[1] اساتذہ نے آپ کے بچوں کو یہ پڑھایا کہ بنگالی ہندو ہو یا مسلمان، وہ مشرقی پاکستان کا رہنے والا ہو یا مغربی بنگال کا، ان سب کی نسل ایک ہے، زبان ایک، کلچر ایک۔ اس تعلیم سے وہ نوجوان جس قسم کی ذہنیت لے کر ابھریں گے اس کا نمونہ آپ نے ڈھاکہ یونیورسٹی کے ایم۔ اے کے طالب علم عزیز الرحمٰن کے اس خط میں دیکھ لیا ہوگا جو طلوع اسلام کی اپریل ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ اس کے دو چار فقرے دہرانے کی اجازت دیجئے۔ اس مسلمان نوجوان نے لکھا تھا کہ غنیمت ہے کہ اب خوابیدہ بنگالیوں میں حرکت کے آثار نمودار ہو رہے ہیں ورنہ ہماری حالت یہ ہو چکی تھی کہ

مشرقی پاکستان کا نوجوان

> ہم سری چیتنیا، خودی رام، سبھاش بوس، بیجئے سنگھ جیسے اپنے قومی ہیروز کو فراموش کر بیٹھے تھے اور ان کی جگہ خالدؓ، طارقؒ، موسیٰؒ اور (حضرت) علیؓ جیسوں کو اپنا ہیرو سمجھنے میں فخر محسوس کرنے لگ گئے تھے۔ ہم نے اپنے دیس کے بھگوان کو بھلا دیا تھا اور اس کی جگہ ایک غیر ملکی، بدیشی خدا کو اپنا معبود بنا لیا تھا جسے اللہ کہا جاتا ہے۔ ہم اپنے بچوں کا نام اپنی زبان کے بجائے ایک اجنبی زبان میں رکھنے میں خوشی محسوس کرنے لگے۔ ہم نور اللہ اور خلیل اللہ جیسے ناموں پر ریجھ گئے تھے اور ناگی اور رکھا گتی جیسے سیدھے سادے ناموں کو تیاگ بیٹھے تھے۔

یہ خط اس نوجوان نے لکھا تھا بنگالی سالِ نو کی تقریب منانے کے سلسلہ میں۔ اس ضمن میں اس نے، اس تقریب کے منانے والوں سے کہا تھا کہ

> قوم آپ سے پوچھنا چاہتی ہے کہ ہم اس تقریب کو اس طریق سے منائیں جس طریق سے یہ اول سال سے منائی جاتی رہی ہے یا اسے محفلِ میلاد کی طرح منائیں جسے ایک غیر ملکی آئیڈیالوجی کا معتقد طبقہ مناتا ہے۔

معاذ اللہ، صد بار معاذ اللہ!—

> اے محمدؐ! گر قیامت را برآری سر ز خاک — سر برآور وایں قیامت درمیانِ خلق بیں!

---

[1] حال ہی میں اس کا انکشاف ہوا ہے کہ مشرقی پاکستان کے اسکولوں اور کالجوں میں قریب اسّی فیصد اساتذہ ہندو ہیں۔

میں سمجھتا ہوں عزیزانِ من! کہ ان دلخراش اور جگر سوز الفاظ کے سننے سے آپ کا آبگینۂ قلب بھی میری طرح آنکھوں کے چشموں سے خون بن کر بہ نکلا ہوگا۔ لیکن میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ اس کا ذمہ دار کوئی عزیز الرحمٰن نہیں! اس کے ذمہ دار ہم خود ہیں جنہوں نے اس بنیادی مسئلہ سے اس طرح مجرمانہ تغافل برتا اور قوم کے بچوں کو عزیز الرحمٰن اور مجیب الرحمٰن بننے کے لئے ناقۂ بے زمام کی طرح آوارہ چھوڑ دیا۔ آج قوم کا ہر سربراہ حالیہ قیامت پر سینے پر ہاتھ رکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرتا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن میں ان سے کہنا چاہتا ہوں کہ

ستمگر یہ پرسشِ غم کا، مگر اصرار نہ کر
پوچھنے والے یہ تیرا ہی کہیں راز نہ ہو

لیکن ہم مغربی پاکستان والوں کو یہ کہہ کر خود فریبی میں مبتلا نہیں ہو جانا چاہیئے کہ یہ حالات مشرقی پاکستان تک محدود ہیں۔ ہمارے ہاں سب خیریت ہے۔ یہ غلط ہے۔ ہمارے ہاں کے نوجوانوں کی تعلیم بھی اسی نہج پر ہوتی ہے جس کی وجہ سے انہیں بھی نہ یہ معلوم ہے کہ اسلام کے اصول و مبانی کیا ہیں اور وہ نظریۂ حیات و معیارِ قومیت کیا جس پر مملکت پاکستان کی عمارت استوار ہوئی ہے۔ ہمارے ہاں "خیریت" اس لئے نظر آتی ہے کہ مغربی پاکستان کے تمام باشندے نہ ایک نسل سے متعلق ہیں اور نہ ہی ان سب کی زبان ایک ہے۔ اس لئے یہاں کے نوجوانوں کے دل کی دھڑکن ملک گیر ہونے کے بجائے مقامی بن کر رہ جاتی ہے۔ عزیز الرحمٰن نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ

مغربی پاکستان کی حالت

(اب) ہمارا بنگالی جذبہ آہستہ آہستہ بیدار ہو جاتا ہے۔ اس سے اسلامی قومیت کے بند ڈھیلے پڑ جائیں گے اور علاقائی قومیت کے رشتے مضبوط ہو جائیں گے۔ مشرقی پاکستان کی اس روش کے تتبع میں، مغربی پاکستان میں ہمارے سندھی بھائی بھی بیدار ہو رہے ہیں۔ انہوں نے بھی یہ سمجھنا سیکھ لیا ہے کہ ہم راجہ داہر کی اولاد ہیں اور پہلے سندھی اور اس کے بعد کچھ اور ہیں۔

مشرقی پاکستان چونکہ ایک علاقہ تھا اس لئے وہاں ایک علاقائی قومیت نمودار ہوئی۔ مغربی پاکستان چار پانچ علاقوں پر مشتمل ہے اس لئے یہاں چار پانچ قومیتوں کے جراثیم پرورش پا رہے ہیں۔ اسلامی نظریہ قومیت نہ وہاں تھا نہ یہاں ہے۔

مغربی پاکستان کے نوجوانوں کی ذہنیت کیا ہو چکی ہے اس کا اندازہ اس ایک خط سے لگایئے جو ہمیں حال ہی میں موصول ہوا ہے۔ (اور اس قسم کے خطوط اکثر موصول ہوتے رہتے ہیں) یہ لکھنے کے بعد کہ طلوعِ اسلام، نیشنلسٹ علماء کے حق میں جو گستاخیاں کرتا ہے اس سے اسے شرم کرنی چاہیئے۔ لکھا ہے کہ

آج آپ کے ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے کیا وہ دو قومی نظریہ کی ذلت ترین (؟) شکست نہیں۔ ون یونٹ کا ختم ہو جانا اور مشرقی پاکستان کی تباہی کے پس پردہ (جو کچھ ہوا ہے وہ اس بات کی) منہ بولتی ہوئی تصویر ہے کہ قومیں وطن اور زبان سے بنتی ہیں ...... ڈاکٹر اقبالؔ اور ان کے ہمنواؤں کی جذباتی باتوں سے جس قدر نقصان مسلمانوں کے اذہان کو پہنچا ہوا ہے اس پر تو بیسیوں کتابیں لکھی جا سکتی ہیں مگر کیا کیا جائے۔ مسلمانوں کے ذہن جب تک مسدود

رہی گے کہنا اور بتانا لاحاصل ہے ...... آخر میں آپ سے گزارش کروں گا کہ آپ ان مومنین کو جنہوں نے متحدہ قومیت کو اپنایا، اپنے قلم کے نشتروں سے بدنام اور معتوب نہ گردانیں۔ وہ جو کچھ کہہ گئے ہیں اس کی سچائی اب روزِ روشن کی طرح عیاں ہو رہی ہے۔

یہ ہے ہلکا سا عکس اس ذہنیت کا جو خود مغربی پاکستان کے نوجوانوں میں عام ہو رہی ہے۔

پاکستانی قوم ۔ مسلم اور غیر مسلم

علاوہ ازیں ایک چیز ایسی ہے جو یہاں اور وہاں، دونوں جگہ بطورِ قدرِ مشترک موجود ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے مطالبۂ پاکستان کی بنیاد یہ تھی کہ مسلمان دین کے اشتراک کی بنا پر ایک الگ قوم ہے۔ اور کوئی غیر مسلم اس قوم کا جزو قرار نہیں پا سکتا۔ غیر مسلم جداگانہ قوم ہیں۔ ہمارا یہ دعوےٰ جو عینِ اسلام کا دعویٰ تھا، واہگہ کی سرحد تک برقرار رہا، لیکن جونہی ہم نے اس سرحد کو عبور کر کے سرزمینِ پاکستان میں قدم رکھا، اپنے اس بنیادی دعویٰ کو لپیٹ کر الگ رکھ دیا، اور مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کو ملا کر ایک قوم قرار دے لیا۔ چنانچہ یہ اب ایک مسلّمہ حقیقت بن چکی ہے، یعنی ہم نے تسلیم کر لیا ہے کہ قومیت کی بنیاد وطنیت ہے، نظریۂ حیات نہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ آپ جب کسی نوجوان سے اس نظریہ کے متعلق بات کریں تو وہ برملا کہہ دیتا ہے کہ یہ معیار نہ اسلام کا تقاضا تھا، نہ دین کا مطالبہ۔ اسے آپ لوگوں نے اپنا مقدمہ جیتنے کے لئے ایک وکیلانہ حربے کے طور پر اختیار و استعمال کیا تھا۔ مقدمہ جیت لیا، اور حربہ بے کار سمجھ کر الگ کر دیا۔

میں پوچھتا ہوں ملک کے اربابِ دانش و بینش اور اعیانِ سیاست و حکمت سے کہ ان کے پاس نوجوانانِ ملت کے اس اعتراض کا کوئی جواب ہے؟ اتنا ہی نہیں۔ ان کے اس اعتراض کے بعد، بانیانِ پاکستان بالخصوص قائداعظمؒ کے کردار کے متعلق جو تصویر ذہنوں میں ابھرتا ہے، اس کا کوئی مداوا بھی ہے؟ اور عملی اعتبار سے دیکھئے تو مشرقی پاکستان میں جو کچھ ہوا ہے کیا اس کی ایک بنیادی وجہ یہ نہیں کہ ہم نے وہاں کے ڈیڑھ کروڑ ہندوؤں کو بھی مسلمان قوم کا جزو قرار دے رکھا ہے! آپ کچھ بھی کہیئے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ہم نے جو دو قومی نظریہ کی عملی تکذیب سے اسلام کا مذاق اڑایا ہے، یہ سب اس کی سزا ہے۔

حذر! اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

(۰)

محکوم قوموں کی مصیبت یہ ہوتی ہے کہ وہ حاکم اقوام کی ہر ادا میں دلکشی اور جاذبیت محسوس کرتی ہیں۔ وہ ان کے مسلک و مشرب پر تنقیدی نگاہ نہیں ڈالتیں، بلکہ انہیں آنکھیں بند کئے، تقلیداً اختیار کئے رہتی ہیں۔ اپنی آزاد مملکت کے قیام سے ہم جسمانی طور پر تو بے شک آزاد ہو گئے ہیں، لیکن اپنے نظریاتِ زندگی سے بے خبری کی وجہ سے ہم ذہنی طور پر اقوامِ مغرب کے بدستور غلام ہیں اور اس غلامی کی بھی یہ حالت ہے کہ جو نظریہ ان کے ہاں مردود و مطرود قرار پا جاتا ہے ہمارے ہاں بدستور مقبول و محبوب رہتا ہے۔ وطن یا نسل کی بنیادوں پر قومیت کی تشکیل کے نظریہ کے جو تباہ کن نتائج

نیشنلزم اور مغربی مفکرین

دنیا کے سامنے آئے ہیں، ان کے پیشِ نظر اب خود مغرب کے مفکرین اس سے سخت نالاں ہیں۔ میں اس موضوع پر بھی بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔ اس وقت صرف دو ایک آراء پر اکتفا کروں گا۔ لندن یونیورسٹی کا پروفیسر کوبن لکھتا ہے کہ "قومیت پرستی کا احساس نفرت سے

پیدا ہوتا ہے اور عداوت پر پرورش پاتا ہے" رسل نے کہا ہے کہ "نیشنلزم نوعِ انسان کی تباہی کے لئے سب سے بڑی قوت ہے۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ دوسرے ملکوں کی نیشنلزم بڑی خراب چیز ہے لیکن وہ اپنے ملک کی نیشنلزم کے حق میں قصیدے پڑھتا ہے" ہکسلے کہتا ہے کہ "نیشنلزم ایک بت پرستانہ مذہب ہے جو تفریق اور فساد انسانیت کے لئے ایسا طاقتور ہے جس کا مقابلہ کوئی اور مذہب نہیں کرسکتا" اہلِ مغرب جنہوں نے اس نظریہ کو جنم دیا تھا' اس کے ہاتھوں اس قدر نالاں ہیں لیکن ہم کہ جن کے دین نے چودہ سو سال پہلے اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا تھا' اسے سینے سے لگائے لگائے پھر رہے ہیں۔

———(۰)———

وطنیت کے نظریۂ قومیت سے آگے بڑھ کر اب ایک اور نظریہ ہمارے عنان شکن نوجوانوں کے لئے وجہِ جاذبیت بن رہا ہے اور وہ ہے سوشلزم کا نظریۂ قومیت۔ قرآن کی طرح' یہ نظریہ بھی تمام انسانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کرتا ہے لیکن دونوں کے معیارِ تقسیم و تفریق میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ قرآن کا معیار یہ ہے کہ دنیا کے جو انسان' زندگی کی بلند اقدار

سوشلزم کا نظریۂ قومیت

انسانیت کو صحیح تسلیم کریں' وہ ایک قوم کے افراد' جو ان اقدار سے انکار کر کے زندگی کو محض حیوانی سطح پر دیکھیں' وہ دوسری قوم کے ارکان۔ لیکن سوشلزم کا نظریہ یہ ہے کہ زندگی' تو صرف حیوانی سطح کی ہے۔ یعنی طبیعی زندگی اور بس۔ لیکن اس سطح پر دو گروہ پائے جاتے ہیں۔ ایک گروہ محنت کشوں اور کاشتکاروں کا ہے' اور دوسرا گروہ سرمایہ داروں اور زمینداروں کا ہے۔ بالفاظ دیگر' ایک گروہ لوٹے جانے والوں (EXPLOITED) کا ہے اور دوسرا گروہ لوٹنے والوں (EXPLOITERS) کا۔ ان دونوں گروہوں میں شروع ہی سے باہمی تنازعہ اور جنگ جاری ہے اور انسانی تاریخ اسی جدل و پیکار کی داستان ہے۔ جو لوگ جدل و پیکار اور فساد و انتشار برپا کر کے' ذرائع پیداوار استحصال پسندوں کے ہاتھ سے چھین کر' لٹنے والوں کو دیدیں' وہ انقلاب پسند کہلاتے ہیں۔ یہ انقلاب پسند کسی ملک میں ہوں اور کسی نسل سے متعلق' سب ایک قوم کے افراد ہیں۔ مذہب کا اس میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ جب زندگی کو محض طبیعی تسلیم کر لیا جائے تو پھر خدا کا وجود (ان کے الفاظ میں) استحصال پسندوں کے تراشیدہ حربے سے زیادہ کچھ نہیں رہتا۔ لیکن آپ سوچئے کہ ارفع نظریاتِ زندگی' اور بلند اقدارِ انسانیت' سب کو غرقِ مئے ناب کر کے' صرف پیٹ کے مسئلہ کو واحد انسانی مسئلہ قرار دے دینا کس قدر وجہِ تذلیلِ انسانیت ہے۔ اقبالؒ نے اسی بنا پر کارل مارکس کے متعلق کہا ہے کہ

دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس　　　بر مساواتِ شکم دارد اساس

میں چونکہ اس موضوع پر بہت کچھ لکھ چکا ہوں اس لئے اس مقام پر اس کی وضاحت میں جانے کی ضرورت نہیں۔ یہاں میں صرف اتنا کہہ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ خود روٹی کا مسئلہ بھی حیوانی سطحِ زندگی پر حل نہیں ہوسکتا۔ اس کے لئے ایک محکم اساس کی ضرورت ہے اور محکم اساس' قرآن کا عطا کردہ نظریۂ زندگی ہے جو اسلامی قومیت کا مدار قرار پاتا ہے۔

چونکہ ہمارے نوجوانوں کے ذہن میں' نہ خدا کا صحیح تصور ہے' نہ دین کا۔ وہ نہ بلند اقدارِ حیات سے واقف ہیں' نہ انسانی زندگی کی ممکنات سے' اور ملک کے غلط معاشی نظام کی وجہ سے روزگار کے دروازے ان پر بند ہوتے ہیں' اس لئے یہ سوشلزم کے اس نعرے میں بڑی دلکشی محسوس کرتے ہیں اور کشاں کشاں اس کی طرف بہے چلے جاتے ہیں۔ مذہب پرست طبقہ جو اسلام

ان کے سامنے پیش کرتا ہے وہ نظامِ سرمایہ داری کا نقیب ہوتا ہے۔ اس لئے وہ ان نوجوانوں کی منافقانہ ساتھ تازیانہ کا کام دیتا ہے۔ یاد رکھیئے! جتنی کوئی قوم مذہب پرست ہوگی (دین کی حامل نہیں بلکہ مذہب پرست) اس کی فضا اتنی ہی وطنیت، دہریت، سوشلزم وغیرہ کے لئے زیادہ سازگار ہوگی۔ پاکستان میں دین کی تعلیم کو نظرانداز کرکے، مذہب کے فروغ کے لئے جو مسلسل تگ و تاز ہوتی ہے، ہمارے نوجوانوں کی بے راہ روی اسکا منطقی نتیجہ ہے۔

—— (٥) ——

اس مقام پر عزیزانِ من! مجھ سے پوچھا جائیگا کہ ـــ کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں؟ اس کا وہی جواب ہو سکتا ہے جو میں تیس برس سے دیتے چلا آ رہا ہوں۔ پھر اسی جواب پر اعتراض بھی وہی جو پہلے دن سے وارد کیا جا رہا ہے اور اس اعتراض کا بھی میرا وہی پرانا جواب۔

علاج اس کا

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ آپکو قوم کا نظامِ تعلیم بدلنا ہوگا جس سے قوم کے بچوں کے ذہن نشین بلکہ دلنشیں ہو جائے کہ قرآنی تصورِ حیات کیا ہے یعنی خدا نے آدمی کا انسانی زندگی سے تعلق کیا ہے۔ زندگی کے مسائل کیا ہیں اور قرآن ان کا حل کیا بتاتا ہے۔ یہیں سے یہ واضح ہوگا کہ اسلام کا نظریۂ قومیت کیا ہے اور یہ نظریہ کس طرح اسلامی مملکت کی بنیاد قرار پاتا ہے۔ ان نظریات کو چھوڑ کر نہ کوئی فرد مسلمان ہو سکتا ہے اور نہ کوئی مملکت اسلامی کہلانے کی مستحق۔ ہمارے جو بچے ان تصورات کو لیکر بڑے ہونگے، وہ اس قابل ہوں گے کہ نسلی، لسانی، علاقائی، وطنی حدود سے بلند ہو کر، خالص اسلامی نظریہ کی بنیاد پر ایک قوم متشکل کر سکیں۔ یہی نوجوان مملکتِ پاکستان کے جداگانہ وجود کی اہمیت کو سمجھیں گے اور یہی اسکے استحکام و بقا کے لئے ہر قربانی دینے کے لئے ہر وقت آمادہ۔ انہیں نہ کوئی ہندو خرید سکے گا اور نہ ہی کوئی "ازم" ورغلا سکے گی۔

ہندو کے ساتھ مل کر ایک قوم بننا تو ایک طرف، جو قوم اسلام، مسلمان اور پاکستان کی ایسی دشمن ہو اس کے ساتھ ان کے تعلقات کی نوعیت کیا ہوگی، اس کے لئے مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا۔ اسٹیٹسمین (انڈیا) کے ایڈیٹر مسٹر کلاتپ تہر نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے (INDIA ; THE CRITICAL YEARS)۔ اس میں وہ لکھتا ہے کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران فیروزپور سیکٹر میں ایک نوجوان پاکستانی افسر گرفتار ہو گیا۔ وہ سخت زخمی تھا اور اسے خون دینے کی ضرورت تھی لیکن اس نے یہ کہہ کر خون لینے سے انکار کر دیا کہ میں اسلام اور پاکستان کے دشمن کا خون اپنی رگوں میں داخل کرکے جینے کے مقابلہ میں موت کو ترجیح دوں گا ـــ اور اس نے اسی طرح جان دے دی۔

ہم ہر روز، دنیا کے کاروبار سے فارغ ہو کر عشاء کی نماز میں، وتروں کی آخری رکعت میں خدا کے حضور اقرار کرتے ہیں کہ وَنَخْلَعُ وَنَتْرُكُ مَنْ يَّفْجُرُكَ ۔ جو تجھ سے اپنا رشتہ منقطع کر لیتا ہے ہم اس سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ ہم ہر رات سونے سے پہلے، فقط زبان سے یہ اقرار کر لیتے ہیں، اور اسکے باوجود اپنے تمام تعلقات ان سے وابستہ رکھتے ہیں اور دوسری طرف مردِ مجاہد ہے جو جان دے دیتا ہے لیکن ایسے لوگوں سے پیوندسازی نہیں کرتا۔ سچ ہے۔

ملا کی اذان اور مجاہد کی اذان اور

لمبا پروگرام

میرے اس جواب پر اعتراض یہ کیا جاتا ہے ـــ اور یہ اعتراض بھی اتنا ہی پرانا ہے جتنا پرانا میرا یہ جواب ہے ـــ کہ یہ تو بڑا لمبا پروگرام ہے ـــ کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک ـــ زمانے

کے حالات برق رفتاری کے ساتھ بدل رہے ہیں اور آپ ایسا سست خرام علاج تجویز کر رہے ہیں۔ ـــ خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک۔

اور اس اعتراض کا میرا جواب بھی وہی ہے کہ اگر آپ اس کے لئے کوئی (SHORT - CUT) تجویز کر سکتے ہیں تو فرمائیے؟ آپ نے شارٹ کٹس آزما کر دیکھ لئے ہیں۔ ان کا نتیجہ ہنگامہ آرائیوں اور فساد انگیزیوں کے سوا اور کیا برآمد ہوا ہے۔ یاد رکھئے! آپ فطرت کے قاعدوں کو نہیں بدل سکتے۔ انسانی بچے نے جو کچھ تعلیم و تربیت سے سیکھنا ہے، دنیا میں ابھی تک کوئی ایسا انجکشن ایجاد نہیں ہوا جس کے ذریعے وہ سب کچھ اسکے دل و دماغ میں جذب کر دیا جائے۔ مریضِ غم کی ہزار بے چینی اور لاکھ بیتابی، درازیٔ شب میں ایک لمحہ کی بھی کمی نہیں کر سکتی۔ نوجوانوں کے قلب و دماغ کو ایک خاص قالب میں ڈھالنے کے لئے وقت درکار ہوگا۔ آپنے یہی اعتراض آج سے تئیس سال پہلے کیا تھا۔ اگر آپ اس وقت، اس پروگرام کی طوالت اور سست رفتاری سے گھبرا کر اس سے اعراض نہ برتتے اور اس پر عمل شروع کر دیتے تو آپ اپنی موجودہ قوم کا یہ رونا نہ روتے۔ اسے پھر سن لیجئے کہ اس طریق کار کا کوئی بدل ہے نہ کوئی شارٹ کٹ۔ آپنے جب بھی اپنے آپ کو سنبھالنا چاہا، اسی پروگرام کو اختیار کرنا ہوگا۔ یاد رکھئے!

ـــ جنہیں حقیر سمجھ کر بجھا دیا تم نے   وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی

اور یہ چراغ، اس ذاتِ اقدس و اکرم کے نقوشِ قدم کے سوا اور کہیں نہیں ملیں گے جسے اسکے بھیجنے والے نے سراجاً منیراً (جگمگاتی ہوئی قندیل) کہہ کر پکارا ہے اور جس سے کسب ضیاء کے لئے ہم آج یہاں جمع ہوئے ہیں۔

اس قندیل آسمانی سے کسب ضیا کے ہم ہی محتاج نہیں۔ آج تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی ساری دنیا اسکی راہنمائی کے لئے تڑپ رہی ہے۔ مشہور امریکی مفکر "ممفورڈ" (LEWIS MUMFORD) اس باب میں لکھتا ہے۔

تہذیب درحقیقت اس عمل پیہم اور غیر مختتم کا نام ہے جو ایک دنیا اور ایک انسانی برادری کی تشکیل کرے اگر ہم نے اس عملی وحدت کو مزید التواء میں رکھا تو اس کا نتیجہ عالمگیر تباہی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ مغربی انداز معاشرت کا کھیل کھیلا جا چکا ہے اور یہ تمدن بُری طرح ناکام ثابت ہوا ہے ..... اب دنیا کو ایک ایسے بطلِ جلیل کی ضرورت ہے جو اس کلچر اور تاریخ کی تمام حدود کو توڑ دے جس نے انسانوں کو اپنے اندر قید کر رکھا ہے اور اس طرح انکی نشوونما کے راستے میں بُری طرح حائل ہو رہا ہے ـــ اس بطلِ جلیل کی ضرورت جو کاروانِ انسانیت کو موجودہ تباہی کے ویرانوں سے نکال کر، وحدتِ انسانیت کے عالمگیر نظام کی طرف لے جائے۔

(TRANSFORMATION OF MAN)

اور ظاہر ہے کہ یہ بطلِ جلیل، یہ سالارِ کاروانِ انسانیت، اس پیغامبرِ انقلاب کے سوا اور کون ہو سکتا ہے جس نے آج سے چودہ سو سال پہلے، رنگ، نسل، زبان، وطن کی تمام حدود و قیود سے بالاتر ہو کر اعلان کیا تھا کہ

يَا أَيُّهَا النَّاسُ! إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا ـ (۷/۱۵۸) اے نوعِ انسان! میں کسی خاص قوم، خاص ملک کی طرف نہیں، بلکہ عالمگیر انسانیت کی طرف پیغامِ وحدت لے کر آیا ہوں۔

میرا پیغام، ان تمام نظریات، ان تمام آئین و دساتیر، اور ان تمام قوموں اور قوتوں کے خلاف اعلانِ جنگ ہے جو يَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ (۲/۲۷)، جنہوں نے اس انسانی برادری کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے جسے جوڑنے کا حکم خدا نے دیا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ ۚ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (۳۳/۵۶)

بقیہ "لمعات" صفحہ ۵ سے آگے

بلکہ اقتصادی طور پر بھی ایسی پوزیشن میں نہ رکھئے کہ وہ آپ کی زندگی کے ہر شعبہ پر چھائے رہیں - نہ صرف مشرقی پاکستان میں، بلکہ پورے پاکستان میں جہاں جہاں بھی انہیں ایسی پوزیشن حاصل ہے، نہایت ضروری ہے کہ انہیں غیر مؤثر بنا دیا جائے اس میں کسی قسم کے ظلم اور دھاندلی سے کام لینے کی ضرورت نہیں - قانونی پابندیوں کی ضرورت ہے - اگر مملکت پاکستان میں قرآن کا معاشی نظام رائج کر دیا جائے تو یہ مقصد خود بخود حاصل ہو جائے گا - اس نظام میں نہ وسائل پیداوار پر کسی کی ذاتی ملکیت رہتی ہے، اور نہ ہی کسی کے پاس زائد از ضرورت روپیہ - اگر یہاں اس قسم کا نظام رائج ہو جائے تو ہندو یہاں سے خود بخود اپنا ٹھاٹھ باٹھ اٹھا کر چل دے گا - اس وقت، مملکت کی سطح پر، ہندوستان کے ساتھ تبادلۂ آبادی کا مسئلہ بھی طے ہو سکتا ہے - ہندوستان کے مسلمان کو، ہندوؤں کے ظلم و استبداد سے بچانے کا یہی واحد ذریعہ ہے -

---

یہ ہیں اس پروگرام کے اصولی نکات جن پر عمل پیرا ہونے سے، ہمارے نزدیک، پاکستان کی بنیاد مستحکم ہو سکتی ہے - ہمیں اس کا احساس اور اندازہ ہے کہ اس پروگرام کی سخت مخالفت ہوگی —— قدامت پرست طبقہ کی طرف سے بھی اور مفاد پرستوں کی طرف سے بھی —— بالخصوص ان کی طرف سے جنہوں نے تحریک پاکستان کی مخالفت کی تھی اور اب بھی پاکستان کو دل سے قبول نہیں کیا - اس لئے اس پروگرام کو اختیار اور نافذ کرنے کے لئے بڑی مومنانہ فراست اور قلندرانہ جرأت کی ضرورت ہوگی - جو فرد یا گروہ بھی اسے نافذ کرے گا وہی پاکستان کا محافظ اور ملت کا پاسبان قرار پائے گا - لیکن اگر اس کی طرف سے اسی طرح تغافل برتا گیا جس طرح آج تک برتا گیا ہے، تو پھر اس مملکت کا مستقبل خطرات سے خالی نہیں ہو سکتا - جب پاکستانی قوم ان نظریات پر یقین نہیں رکھے گی جو اس کی ہستی کے لئے وجہ جواز ہیں، تو یہ مملکت باقی کیسے رہ سکے گی؟ مکان کی چھت ٹپکتی ہو تو اس کا علاج آسان ہوتا ہے - لیکن اگر پانی اس کی بنیادوں میں چلا جائے تو پھر اس کے گر جانے کا ہر وقت خطرہ ہوتا ہے ◆

پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

لاہور میں

ہر اتوار کی صبح بوقت ۸½ بجے

بمقام

۲۵/بی - گلبرگ ۲ - لاہور

کراچی میں

بروز اتوار - بوقت ۹½ بجے صبح

(بذریعہ ٹیپ)

بمقام - دفتر بزمِ طلوعِ اسلام - فردوس کالونی - پہلی چورنگی ناظم آباد - کراچی

ہندو مذہب کیا ہے؟

(۱)

ہندوؤں کی اسکیم یہ تھی کہ جس طرح وہ باہر سے آنے والی قوم کو اپنے اندر جذب کر کے اس کا جداگانہ تشخص ختم کر چکے تھے، مسلمانوں کو بھی اسی طرح ہڑپ کر لیا جائے۔ لیکن ان کی اس اسکیم کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ اسلام تھا جو ہندو مذہب اور ثقافت کے مقابلہ میں کہیں ارفع و اعلیٰ تھا۔ اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لئے انہوں نے تجویز یہ کی کہ ہندوستان میں بسنے والے شہریوں کے بچوں کو تعلیم یہ دی جائے کہ سب مذہب برابر ہیں۔ کسی ایک کو دوسرے پر فوقیت حاصل نہیں۔ مہاتما گاندھی نے ۱۹۴۷ء میں کہا تھا کہ

> میری روح اس بات کے تصور سے بغاوت کرتی ہے کہ اسلام اور ہندو مت مختلف اور متضاد کلچر اور نظریۂ حیات کے حامل ہیں۔ کسی ایسے نظریہ کا تسلیم کر لینا میرے نزدیک خدا کے انکار کے مترادف ہے کیونکہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کا خدا بھی وہی ہے جو گیتا کا ہے۔
>
> (ہندوستان ٹائمز بحوالہ ۱۴)

اس تصور کو عملی شکل دینے کے لئے انہوں نے، ڈاکٹر ذاکر حسین (مرحوم) کے تعاون سے ایک تعلیمی اسکیم مرتب کی جسے وارد ھا تعلیمی اسکیم کہا جاتا تھا۔ اس سکیم کے تعارف کے سلسلہ میں انہوں نے کہا تھا کہ

> یہ سخت خطرناک بات ہے کہ بچوں کو یہ پڑھایا جائے کہ ان کا مذہب باقیوں سے افضل ہے، حالانکہ سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ (وارد ھا تعلیمی اسکیم)

یہ آخری فقرہ (مولانا) ابوالکلام آزاد (مرحوم) کی تفسیر سورۂ فاتحہ (ترجمان القرآن) سے لیا گیا تھا جو گاندھی کے اس تصور کو "اسلامی سند" بہم پہنچانے کے لئے لکھی گئی تھی۔

یہ اسکیم اس وقت تو غرقِ دریا ہو گئی، لیکن پاکستان قائم ہونے کے بعد انہوں نے اسے جاری رکھا۔ پچھلے دنوں آپ نے اخبارات میں پڑھا ہوگا کہ مشرقی پاکستان میں قریب (۸۵) فی صد اساتذہ ہندو ہیں۔ ظاہر ہے کہ

وہ اساتذہ وہاں کے بچوں کو بھی تعلیم دیتے ہوں گے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہاں کا نوجوان تعلیم یافتہ (مسلمان) طبقہ اب "عزیز الرحمٰن" کی شکل میں سامنے آرہا ہے جس کا خط آپ نے طلوعِ اسلام بابت اپریل ۱۹۷۱ء کے لمعات میں ملاحظہ کرلیا ہوگا۔ اس خط میں لکھا تھا کہ یونیورسٹی کے ایم۔ اے کے اس طالب علم نے لکھا تھا کہ یہ کیا قیامت ہے کہ ہم سے ہمارا بھگوان چھین لیا گیا اور اس کی جگہ ایک بدیشی خدا ہم پر مسلط کر دیا گیا جسے اللہ کہا جاتا ہے۔

ہماری انتہائی بدقسمتی ہے کہ اس تئیس سال کے عرصہ میں ہم نے اپنے نوجوانوں کو نہ یہ بتایا کہ اسلام کیا ہے اور نہ یہ کہ ہندو کیا ہے۔ اس کے عزائم کیا ہیں اور اس کا مذہب کیا۔ طلوعِ اسلام کی سابقہ اشاعت میں ہم تفصیلاً بتا چکے ہیں کہ "ہندو کیا ہے"۔ اشاعتِ حاضرہ میں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ "ہندو مت جب کیا ہے" محترم پرویز صاحب کی ایک نہایت محققانہ تصنیف ہے "مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں"۔ اس میں انہوں نے یہ بتایا ہے کہ مختلف مذاہب کی مبینہ آسمانی کتابیں کس طرح مرتب ہوئیں، کن کن مراحل سے گذریں، آج ان کی حالت کیا ہے اور ان کی تعلیم کیا۔ زیرِ نظر مقالہ ان کی اسی تصنیف کا ایک باب ہے۔ چونکہ مقالہ طویل ہے اس لئے اسے بالاقساط شائع کیا جائے گا۔ قسطِ اول درجِ ذیل ہے۔

(○)

ہندو مت

اب ہم اپنے سفر کے اس حصہ میں پہنچ رہے ہیں جہاں راستہ نہایت دشوار گذار اور مرحلہ بہت نازک ہے اس لئے کہ آج تک یہ متعین ہی نہیں کیا جاسکا کہ ہندو کہتے کسے ہیں۔ اس لئے یہ سمجھنا بھی مشکل ہے کہ ہندو مت ہے کیا؟ مذہبی عقاید کی رُو سے ایک ہندو دوسرے ہندو سے اتنا مختلف ہو سکتا ہے جتنا ایک ہندو کسی غیر ہندو سے۔ ذرا آگے چل کر آپ خود دیکھ لیں گے کہ ہندو مت کن کن متضاد عناصر کے مجموعہ کا نام ہے۔ بنارس ہندو یونیورسٹی کی کورٹ کونسل اور سینیٹ کے ممبر مسٹر گوندواس اپنی کتاب ہندوازم میں لکھتے ہیں:-

> اگرچہ سب سے پہلے اس امر کا متعین کرلینا نہایت ضروری ہے کہ ہندو مت کسے کہتے ہیں اور اس کا ماخذ کیا ہے؟ لیکن جنہوں نے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ اس کا جواب کس قدر مایوس کن ہے۔ ہندو دھرم کی کوئی تعریف (DEFINITION) ممکن نہیں اس لئے کہ اس کے حدود ہی متعین نہیں۔ یہ باب دراصل علم الانسان سے متعلق تھا جسے بدقسمتی سے مذہب کا نام دے دیا گیا۔ ویدوں سے شروع ہو کر اور چند ایک قبائل کے رسم و رواج کو اپنے آغوش میں لے کر یہ آگے بڑھا اور ایک برف کے گولے کی طرح مختلف زمانوں میں لڑھکتے لڑھکتے

اپنے حجم میں بڑھتا چلا گیا اور جس جس قوم اور قبیلہ سے یہ متمسک ہوا اس کے رسوم اور تخیلات کو اپنے اندر جذب کرتا گیا۔ حتیٰ کہ اس وقت تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ یہ مذہب محیطِ کل، ہمہ گیر، ہر ایک کو اپنے اندر جذب کر لینے والا، سب کچھ برداشت کر لینے والا، ہر ایک کو (اپنی اپنی جگہ) مطمئن رکھنے والا، اور ہر ایک کے ارشاد کی تعمیل کرنے والا واقع ہوا ہے۔ (ص ۳۸)

ہندو کسے کہتے ہیں

اس کے بعد مسٹر گوبند داس لکھتے ہیں کہ ہندو ہونے کے لئے:۔

(۱) ہندو گھرانے میں پیدا ہونے کی بھی شرط نہیں۔

(۲) بھارت ورش کے حدود کے اندر پیدائش کی بھی شرط نہیں۔

(۳) ویدوں پر ایمان بھی ضروری نہیں۔ گیتا بڑی سختی سے ویدوں کی تکذیب کرتی ہے۔ چارواک بڑے شد و مد سے ان کا مذاق اڑاتے ہیں اور انہیں مسخروں اور پشاچ (رنگین طبع) لوگوں کی تصانیف قرار دیتے ہیں۔ جینی، سکھ اور کئی فرقے ان کی تردید کرتے ہیں۔ ہندومت ویدوں کی تصانیف سے بھی پہلے موجود تھا۔ اس کی فنا یا بقا ویدوں سے منسلک نہیں۔

(۴) ذات پات (یعنی ورنوں کی تقسیم) کا عقیدہ بھی ضروری نہیں۔

(۵) گائے کی تقدیس اور برہمنوں کی عظمت کا عقیدہ بھی ضروری نہیں۔ اچھوت گائے کا گوشت بلا اعتراض کھا جاتے ہیں۔

(۶) خدا پر ایمان بھی ضروری نہیں۔ ہندوؤں کے چھ قدیمی مذاہب فلسفہ میں سے یوگ کے سوا اور کوئی خدا کا قائل نہیں۔

(۷) سر کی چٹیا بھی ضروری نہیں۔

(۸) زنار کی بھی شرط نہیں۔

(۹) کھانے پینے میں حلال اور حرام کی بھی کوئی پابندی نہیں۔ جو ایک کے نزدیک حلال ہے وہ دوسرے کے نزدیک حرام ہے۔

(۱۰) کوئی رسم و رواج بھی ایسا نہیں جو لاینفک ہو۔

(۱۱) کرم (جزا و سزا) روح اور اوتاروں پر ایمان رکھنا بھی ضروری نہیں۔

(۱۲) "ہندو لاء" (ہندوؤں کے مروجہ قانون) کا اطلاق بھی ضروری نہیں، اس لئے کہ یہ قانون بھی متضاد عناصر کا مجموعہ ہے جو ایک کے نزدیک نہایت ضروری ہے وہ دوسرے کے ہاں یکسر غیر ضروری ہے۔

(۱۳) نسل اور رنگ کا امتیاز بھی کوئی ضروری شرط نہیں۔

لہٰذا اس سے ظاہر ہے کہ ہر وہ شخص جو ہندو کہلانے سے انکار نہیں کرتا، یا یوں کہیے کہ جو اقرار کرتا ہے

کہ وہ ہندو ہے ۔ ہندو قرار دیا جا سکتا ہے۔ (ہندو ازم ۵۷ ۔ ۵۰)

غور کیجئے کہ ایسے مذہب کے متعلق تاریخی چھان بین اور اس کے "مسلمات" کی تحقیق و تفتیش کس قدر مشکل ہے یعنی جہاں یہی متعین نہیں ہو سکتا کہ ہندو ہونے کے لئے شرائط کیا ہیں وہاں ان شرائط کے اصلی یا محرف ہونے کے متعلق کیا تحقیق کیا جا سکے؟ اس باب میں پنڈت جواہر لال نہرو اپنی سوانح عمری میں تحریر فرماتے ہیں:۔

ہندومت کے دائرہ میں بے حد مختلف اور بعض اوقات متضاد خیالات اور رسوم داخل ہیں۔ اکثر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندومت پر صحیح معنوں میں مذہب کا اطلاق نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے باوجود اس کی گرفت کتنی سخت ہے اور اس میں بقا کی کتنی زبردست قوت موجود ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص کھلم کھلا خدا کا منکر ہو (جیسے قدیم ہندو فلسفی چارواک تھے) لیکن یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ شخص ہندو نہیں رہا۔ جو لوگ ہندو گھرانوں میں پیدا ہوئے ہیں، وہ چاہے کتنی ہی کوشش کریں۔ ہندومت ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ میں برہمن پیدا ہوا تھا اور برہمن ہی سمجھا جاتا ہوں، چاہے مذہبی اور سماجی رسموں کے متعلق میرے خیالات اور میرے اعمال کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ (میری کہانی۔ جلد اول صفحہ ۲۰۲)

۱۹۴۶ء میں پنڈت جی کی ایک کتاب (THE DISCOVERY OF INDIA) شائع ہوئی تھی جس میں انہوں نے ہندوازم کے متعلق مزید تفصیل سے لکھا تھا۔ وہ اس باب میں رقمطراز ہیں:۔

ہندوازم بہ حیثیت ایک عقیدہ کے بالکل مبہم، غیر متعین، بہت سے گوشوں والا واقع ہوا ہے جس میں ہر شخص کو اس کے مطلب کے مطابق بات مل جاتی ہے۔ اس کی تعریف (DEFINITION) بتانا ممکن نہیں۔ حتیٰ کہ حتمی طور پر یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ آیا یہ کوئی مذہب بھی ہے یا نہیں۔ یہ اپنی موجودہ شکل میں بہت سے عقاید اور رسوم کا مجموعہ ہے جو اعلیٰ سے اعلیٰ بھی ہیں اور ادنیٰ سے ادنیٰ بھی۔ باہمد گر مختلف حتیٰ کہ ایک دوسرے سے متضاد، اس کا لازمی عنصر غالباً جذبہ رواداری ہے۔ مہاتما گاندھی نے کوشش کی ہے کہ اس کی تعریف (DEFINITION) پیش کر سکیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

"اگر مجھ سے کہا جائے کہ ہندو مذہب کی تعریف بیان کرو تو میں صرف اتنا کہوں گا کہ یہ عدم تشدد کے ذریعہ سچائی کی تلاش کا نام ہے۔ ایک شخص خواہ خدا کو بھی نہ مانے لیکن بایں ہمہ وہ ہندو کہلا سکتا ہے۔ ہندوازم نہایت شدت سے سچائی کی تلاش کا نام ہے۔ ہندوازم سچائی کا مذہب ہے سچائی ہی خدا ہے۔ خدا کے انکار سے ہم واقف ہیں لیکن سچائی سے انکار کہیں نہیں سنا گیا"

گویا گاندھی جی کے الفاظ میں اہمسا اور سچائی، یہ ہے ہندو مذہب۔ لیکن بہت سے مشہور اور سچے ہندو یہ کہتے ہیں کہ اہمسا ہندو مذہب کا جزو نہیں ہے۔ لہٰذا باقی صرف سچائی رہ گئی جسے ہم

ہندو مذہب کہہ سکتے ہیں۔ لیکن یہ تو کوئی تعریف (DEFINITION) نہیں۔ (صفحہ ۵۳)

گاندھی جی کی تصریحات پر غور کیجئے۔ یعنی ایک شخص خدا کا منکر ہوتے ہوئے بھی صداقت (TRUTH) کا متلاشی رہ سکتا ہے؟ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ صداقت ہی خدا ہے۔ معلوم نہیں کہ پھر "خدا کے انکار اور صداقت کی تلاش" سے ان کا مطلب کیا ہے؟

میرے ایک دوست نے ہندو اکابر مثل بنارس یونیورسٹی کے ڈین اور مہاتما گاندھی کی خدمت میں استفسارات بھیجے کہ وہ اس موضوع پر کچھ روشنی ڈالیں کہ کسی شخص کے ہندو ہونے کے لئے کیا شرائط ہیں۔ لیکن ان کی طرف سے ان استفسارات کا کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ اس باب میں مہاتما گاندھی کے اخبار ہریجن (بابت ۱۵ ۱۲/۳۴) کے مقالہ افتتاحیہ کی ذیل کی سطور کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ اس میں لکھا ہے۔

> ایک طویل عرصہ کے مصائب اور سخت تجربہ کے بعد ہندوستان کے مذہبی فرقوں نے مذہبی رواداری کا جوہر بطور عادت عامہ پیدا کیا۔ اگر ہندو ازم کی اصطلاح کا اطلاق شومت، وشنومت، جین مت، بدھ مت، وحدانیت، شرک، حیوان پرستی حتیٰ کہ خدا سے انکار جیسے متضاد و متخالف مسالک پر کیا جا سکتا ہے تو ان سب میں قدر مشترک غالباً یہی جذبہ رواداری[1] (TOLERENCE) ہے۔ (ہریجن، بابت ۱۵ ۱۲/۳۴)

---

[1] یعنی ہندو ازم کی خصوصیت کیری نہیں بلکہ اس کی اساس و بنیاد اس پر ہے کہ یہ متضاد سے متضاد عناصر کو بھی اپنا کر جذبہ رواداری کا ثبوت دیتا ہے۔ اس قسم کی رواداری کے متعلق گبن لکھتا ہے کہ

> ایک رواداری فلاسفر کی ہے جس کے نزدیک سب مذاہب سچے ہیں،
> ایک رواداری مؤرخ کی ہے جس کے نزدیک سب مذاہب جھوٹے ہیں
> ایک رواداری سیاسی مدبر کی ہے جس کے نزدیک تمام مذاہب اس کی مطلب براری کے لئے یکساں مفید ہیں۔ ایک رواداری اس شخص کی ہے جو ہر قسم کے خیالات و مشارب کو برداشت کر لیتا ہے محض اس لئے کہ وہ کسی مسلک و مشرب کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ ایک رواداری ایک کمزور انسان کی ہے جو محض اپنی کمزوری کی وجہ سے ان تمام حملوں کو برداشت کرتا ہے جو ان خیالات اور افراد پر کئے جاتے ہیں جو اسے محبوب ہیں۔

رواداری کی ان اقسام میں سے کوئی قسم بھی بقول علامہ اقبالؒ اخلاقی قیمت نہیں رکھتی۔

ہندوستت کے متعلق یہ چیز کچھ آج کی پیداشدہ نہیں۔ خود منوجی کا قول ہے کہ "دھرم کی سچی اتباع اپنے آپ کو اپنے ماحول کے قالب میں ڈھال لینے کا نام ہے" (ہندوازم صفحہ ۵۵)۔ مسٹر گوبند داس کی تحقیق کے مطابق تو ہندو کا لفظ بھی سنسکرت کی کسی قدیم یا جدید کتاب میں نہیں ملتا۔ بلکہ اس کا سراغ پارسیوں کی ژندا ور اوستا میں ملتا ہے۔ (۳۹) باقی رہا باہمی تضاد کا معاملہ، سو خود مہا بھارت میں ہے کہ

ویدوں کے احکام ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ اسی طرح سمرتی کے احکام بھی۔ کوئی رشی ایسا نہیں جس کی تعلیم دوسرے رشی کی تعلیم کے مخالف نہ ہو۔ (ہندوازم۔ صفحہ ۶۲)

اس تضاد کے علاوہ ایک بڑی دقت یہ بھی ہے کہ ہندوؤں کی تاریخ کہیں محفوظ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ (علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں) جس طرح ایک فرد کی انفرادیت کا انحصار اس کے حافظہ پر ہوتا ہے۔ اگر اس کا حافظہ ضائع ہو جائے تو اس کا احساس انفرادیت بھی ختم ہو جاتا ہے، وہ اپنے آپ کو کھو بیٹھتا ہے۔ اسی طرح ایک قوم کی انفرادیت کا مدار اس کے قومی حافظہ یعنی تاریخ پر ہوتا ہے۔ جس قوم کی تاریخ محفوظ نہیں رہتی اس کا قومی تشخص بھی باقی نہیں رہتا۔ اس دشواری کے متعلق (GEORGE SARTON) اپنی کتاب (INTRODUCTION TO THE HISTORY OF SCIENCE) میں لکھتا ہے۔

تاریخ محفوظ نہیں

وقائع نگاری کے فقدان کی وجہ سے ہندو سائنس کا مطالعہ بہت دشوار ہو چکا ہے۔ ہندوؤں کی بیان کردہ تواریخ اسی صورت میں قابلِ یقین سمجھی جا سکتی ہیں جب ان کی توثیق غیر ہندی (یونانی، عربی، چینی) مؤرخ کریں۔ (صفحہ ۳۶)

مؤرخین کی تحقیق یہ ہے کہ "۱۲۰۰ء سے پہلے کی ہندوستان کی تاریخ کے متعلق کوئی قابلِ تذکرہ کتاب جس کو تاریخی کتاب کہا جا سکے، یا کوئی ایسی تصنیف جس سے اس ملک کے حالات معلوم ہو سکیں، اس ملک کے باشندوں یعنی ہندوؤں نے نہیں لکھی" (مقدمہ تاریخ ہند قدیم صفحہ ۱)۔ مشہور مؤرخ الفنسٹن (سابق گورنر صوبہ بمبئی) اپنی کتاب تاریخ ہند میں رقمطراز ہے۔

جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کوئی کیسی ہی جاہل اور اکھڑ قوم کیوں نہ ہو، اکثر اپنے آباؤ اجداد کے حالات کی کوئی نہ کوئی کتاب رکھتی ہے تو اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ ہندوؤں کے پاس باوجودیکہ ان کی قوم نہایت عمدہ شائستگی اور تربیت کے درجے پر پہنچ گئی تھی کوئی کتاب تاریخ سے ملتی جلتی ہوئی بھی نہیں ہے۔ ہندوؤں کے حالات کی تحریروں میں سے جو کچھ موجود ہے وہ جھوٹی کہانیوں اور مبالغہ آمیز جھوٹے تاریخی واقعات سے اس طرح خلط ملط ہے کہ ان میں سے کوئی سچی مسلسل تاریخ نکلنے کی توقع نہیں ہو سکتی، اور نہ کسی عام واقعے کی تاریخ اسکندر کے یورش

کرنے سے پہلے کی نت ام ہوسکتی ہے اور نہ کوئی مسلسل بیان ہندوؤں کے حالات کا ہندوستان پر مسلمانوں کے تسلط کرنے تک کا لکھا جا سکتا ہے۔

مشہور فرانسیسی عالم ڈاکٹر لیبان کا بیان ہے۔

ان ہزارہا جلدوں میں جو ہندوؤں نے اپنے تین ہزار سال کے تمدن میں تصنیف کی ہیں ایک تاریخی واقعہ بھی صحت کے ساتھ درج نہیں ہے۔ اس زمانہ کے کسی واقعہ کو معین کرنے کے لئے ہمیں بالکل بیرونی سہاروں سے کام لینا پڑتا ہے۔ ان کی تاریخی کتابوں میں یہ عجیب خاصیت (یعنی) ہر چیز کو غلط اور غیر فطری صورت میں دیکھنے کی خاصیت) نہایت بیّن طور پر پائی جاتی ہے اور انسان کو اس خیال پر مجبور کرتی ہے کہ ان کا دماغ ہی ٹیڑھا ہے .... قدیم ہندوؤں کی کوئی تاریخ ہی نہیں ہے اور نہ عمارات اور یادگاروں سے اس کی تلافی ہوتی ہے .....
ہندوستان کا تاریخی زمانہ فی الواقعہ مسلمانوں کی فوج کشی کے بعد سے شروع ہوا، اور ہندوستان کے پہلے مؤرخ مسلمان ہیں۔ (تمدن ہند۔ صفحہ ۴۴۱ - ۴۴۷)

خود بھائی پرمانند صاحب کا ارشاد ہے:۔

ہندوستان میں جو عام طور پر تاریخی کتابیں رائج ہیں ان کے تین حصے ہیں زمانہ قدیم جو کہ بالکل نامکمل ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے بزرگوں کو اپنے حالات درستی سے قلمبند کرنے کا شوق نہ تھا۔ اور جو کچھ حالات لکھے ہوئے ملتے ہیں وہ شاعرانہ مبالغہ سے بھرے ہوئے ہیں جن کی امداد سے صحیح واقعات پر پہنچنا محال ہے۔ غالباً سوسائٹی کے اندر ایسی تبدیلیاں ہوئی ہی نہ ہوں گی جن کو قلمبند کرنے کا انہیں خیال آتا۔

(رسالہ زمانہ کانپور ستمبر و اکتوبر ۱۹۱۴ء مضمون "تاریخ ہند" کا مطالعہ)

پنڈت جواہر لال نہرو اپنی کتاب (THE DISCOVERY OF INDIA) میں رقمطراز ہیں:۔

اہل چین، اہل یونان اور عربوں کے برعکس قدیم ہندوستان کے لوگ مؤرخ نہیں تھے۔ یہ ہماری بڑی بدقسمتی ہے اور اسی نے یہ دشواری پیدا کر دی ہے کہ ہم گزشتہ عہد کے واقعات کا زمانہ یا تاریخ متعین کر سکیں۔ یہ واقعات کچھ اس طرح باہم گڈمڈ گتھم گتھا ہو رہے ہیں کہ ان سے عجیب خلفشار پیدا ہو جاتا ہے ..... ہمارے ہاں صرف ایک کتاب (یعنی کلہان کی راج ترنگنی) ایسی ہے جسے ہم تاریخی کتاب کہہ سکتے ہیں۔ یہ کتاب کشمیر کی تاریخ ہے اور بارہویں صدی عیسوی میں لکھی

گئی تھی۔ باقی واقعات کے لئے ہمیں تصورات کی دنیا میں جانا پڑتا ہے ...... یا پھر بیرونی مؤرخین مثل اہلِ یونان، اہلِ چین اور عربوں کی شہادت پر ..... مثال کے طور پر بکرمی سمت کو لیجئے۔ یہ ۵۷ ق م سے شروع ہوتا ہے۔ لیکن اس زمانہ کے ادھر اُدھر ہمیں تاریخ میں کسی بکرماجیت کا اتا پتا نہیں ملتا۔ ایک بکرماجیت چوتھی صدی عیسوی میں گذرا ہے۔ لیکن یہ چوتھی صدی عیسوی کا بکرماجیت اس سمت کا موجد کیسے ہو سکتا ہے جو ۵۷ ق م سے شروع ہوتا ہے۔ اس بکرماجیت کو اس سمت سے متعلق ثابت کرنے کے لئے ہمارے پڑھے لکھے طبقہ نے جس طرح تاریخ سے کھیل کھیلا ہے وہ نہایت تعجب انگیز ہے۔ وہ اس بات پر بھی بڑا زور دیتے ہیں کہ یہی وکرم ہے جس نے باہر سے آنے والوں کے خلاف جنگِ آزادی کو برپا کیا اور اس بات کے لئے اپنی پوری کوشش صرف کر دی کہ ہندوستان اکھنڈ رہے اور ایک ہی قومی حکومت کے ماتحت ہو حالانکہ وکرم کی سلطنت شمالی اور وسطی ہندوستان سے آگے نہیں تھی .... یہ حقیقت ہے کہ ہندوستانی (یعنی ہندو) اپنی قدیم روایات ہی کو تاریخ تسلیم کر لیتے ہیں اور اس پر کسی قسم کی ناقدانہ نگاہ نہیں ڈالتے انہیں اس قسم کے غیر ذمہ دارانہ طریقِ فکر اور نہایت آسانی سے نتائج تک پہنچ جانے کے مسلک کو بالآخر چھوڑنا پڑے گا۔ (صفحہ ۷۶، ۷۷)

زمانہ کا تعین

جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے۔ جس قوم کی تاریخ محفوظ نہ ہو اس کا قومی حافظہ ضائع ہو جاتا ہے اور جب حافظہ ضائع ہو جائے تو ظاہر ہے کہ کسی واقعہ کی نسبت بھی یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کب ظہور پذیر ہوا۔ چونکہ ہندو اپنے دھرم کی قدامت کے مدعی ہیں اس لئے وہ (شاید غیر شعوری طور پر) ہر واقعہ کو قدیم سے قدیم زمانہ کے ساتھ وابستہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور لاکھوں برس کے اعداد و شمار سے ورے کسی چیز کو متعین ہی نہیں کرتے۔ مثلاً سورج سدھانتا ہندوؤں کی علمِ ہیئت کی مشہور کتاب ہے۔ (SARTON) کی تحقیق کے مطابق یہ کتاب پانچویں صدی عیسوی کی تصنیف ہے (سارٹن کی کتاب مذکور صفحہ ۳۸۷)۔ اور پادری بنٹلی صاحب اسے گیارھویں صدی عیسوی کی تصنیف خیال کرتے ہیں۔ لیکن ہندو اس کتاب کو اکیس لاکھ پینسٹھ ہزار سال قبل کی تصنیف بتاتے ہیں۔ (کلیاتِ آریہ مسافر حصہ اول صفحہ ۱۱)۔ ہندوؤں کے ہاں دنیا کو چار زمانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جن کی مدت حسبِ ذیل ہے۔

(۱)	ست جگ	۱۷،۲۸،۰۰۰	سال
(۲)	ترت جگ	۱۲،۹۶،۰۰۰	"
(۳)	دوا پارہ	۸،۶۴،۰۰۰	"

(۴) کال جگ موجودہ زمانہ۔ جس کے پانچ ہزار سال گذر چکے ہیں، اور جس کی مدت ۴،۳۲،۰۰۰ سال کی ہے۔

(ملاحظہ ہو۔ ہندوازم۔ صفحہ ۲۰۱)

جینیوں کے ہاں زمانہ کا شمار کس حساب سے ہوتا ہے، اس کے متعلق سوامی دیانند نے اپنی کتاب ستیارتھ پرکاش میں عجیب وغریب معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ ان کی تحقیق کے مطابق۔

ستر لاکھ سال × ایک کروڑ × چھپن ہزار × ایک کروڑ = ایک پورو

اسنکھیانت پورو = پلیویم کال

دس کروڑ پلیویم کال × دس کروڑ پلیویم کال = اُت سرپنی کال

اُت سرپنی کال × اُت سرپنی کال = کال چکر

مذکورہ بالا اعداد وشمار میں جب تک اسنکھیات کا مفہوم سمجھ میں نہ آجائے، بات آگے نہیں چل سکتی۔ اس لئے اسنکھیات کے متعلق سوامی جی نے ایک مثال سے سمجھایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک چار کوس مربع اور اتنا ہی گہرا کنواں کھود کر اس کو ایسے بالوں کے ٹکڑوں سے بھر دیں جو آجکل کے آدمیوں کے بال سے چار ہزار چھیانوے حصہ پتلا ہو۔ ان پتلے بالوں کے ایسے ایسے چھوٹے ٹکڑے کریں کہ ایک انگل میں چھپن ٹکڑے ہوں۔ ان ٹکڑوں سے اس کنوئیں کو اس طرح ٹھوس دبا کر بھریں کہ اس کے اوپر سے کل ندی زمین کے راجہ کا لشکر گذر جائے تب بھی نہ دبے۔ اب ان ٹکڑوں میں سے سو سو سال کے بعد ایک ایک ٹکڑا نکالیں۔ جب وہ کنواں خالی ہو جائے تب ایک پلیویم کال ہوتا ہے۔ اس سے اگلا حساب سمجھ لیجئے۔ (ویدا اور اس کی قدامت — مولانا اکبر شاہ خاں مرحوم)۔

جب زمانہ کے تعین اور شمار کے متعلق ایسے ایسے معیار مقرر ہوں تو ظاہر ہے کہ واقعات وحوادث بھی ان ہی پیمانوں سے ماپے جائیں گے۔ چنانچہ مہاراج رام چندر جی کے والد بزرگوار دسرتھ کے متعلق تحریر ہے کہ جب ان کی عمر ساٹھ ہزار سال کی ہوئی، تو ان کے ہاں چار بیٹے پیدا ہوئے (ہندوازم۔ صفحہ ۱۳۲) اسی طرح لکھا ہے کہ...... مہارانی سیتا جی کی پہلی اولاد اس وقت ہوئی جب ان کی عمر دس ہزار تینتیس سال کی تھی۔ (ایضاً) اور یہ معلوم ہے کہ سیتا جی کا سوامبر پانچ سال کی عمر میں ہوا تھا، جب کہ رام چندر جی کی عمر بارہ برس کی تھی۔ مہاراجہ رام چندر جی کی عمر کا اندازہ اس سے لگایئے کہ جب سب کچھ ہو چکنے کے بعد سیتا جی زمین میں سما گئی ہیں تو اس واقعہ کے دس ہزار سال بعد تک رام چندر جی مہاراج برسرِ حکومت رہے۔ (یہ سب کچھ رامائن کے بیان کے مطابق ہے) اسی طرح راجہ بھارت کی عمر (جس کی نسبت سے ہندوستان کو بھارت ورش کہا جاتا ہے) شاستروں میں دس ہزار برس کی لکھی ہے۔

———(۰)———

اگرچہ جیسا کہ مسٹر گووندہ داس نے لکھا ہے، ہندو ہونے کے لئے ویدوں کا ماننا بھی ضروری نہیں لیکن چونکہ

وید

عام طور پر ہندو دھرم کی بنیاد ویدوں پر قرار دی جاتی ہے اس لئے موضوع کی ابتداء ویدوں ہی سے کی جانی مناسب ہے۔ وید کے لفظی معنی ہیں علم۔ اگرچہ آجکل عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ وید چار کتابوں کا نام ہے۔ لیکن درحقیقت وید کسی خاص کتاب کا نام نہیں۔ ڈاکٹر سریندر ناتھ داس گپتا (پرنسپل سنسکرت کالج، کلکتہ) اپنی مشہور کتاب (A[1] HISTORY OF INDIAN PHILOSOPHY Vol.1) میں لکھتے ہیں:۔

> ایک طالب علم جسے پہلے پہل سنسکرت لٹریچر سے متعارف کرایا جائے یہ دیکھ کر پریشانی سی محسوس کرے گا کہ متضاد مطالب اور موضوعات پر مختلف مستند کتابیں ہیں لیکن ان سب کا نام وید یا سمرتی (سنی سنائی باتیں) ہے۔ یہ اس لئے کہ وید اپنے وسیع مفہوم کے اعتبار سے کسی خاص کتاب کا نام نہیں بلکہ یہ نام ہے قریب دو ہزار سال کے طویل عرصہ پر پھیلے ہوئے لٹریچر کا۔ چونکہ یہ لٹریچر مظہر ہے اس علمی تگ و تاز کے ماحصل کا جو ہندوستان کے رہنے والوں نے مختلف اطراف و جوانب میں اس قدر طویل عرصہ میں جمع کیا۔ اس لئے اسے لازماً متضاد عناصر کا مجموعہ ہونا چاہیئے۔ (صفحہ ۱۲-۱۱)

یعنی قریب دو ہزار سال کے عرصہ میں ہندوستان کے باشندوں نے مختلف علوم و رسوم سے متعلق جو کچھ جمع کیا اس کا نام ہے وید۔ اس مجموعہ کو زمانہ، اسلوب بیان اور موضوع کے اعتبار سے چار اقسام پر منقسم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) سمہت (SAMHITA) یا گیتوں کا مجموعہ

(۲) برہمن

(۳) آرنیک (ARANYAKAS)

(۴) اُپ نشد

> نثر و نظم کا یہ تمام مجموعہ زمانہ قدیم میں ایسا مقدس سمجھا جاتا تھا کہ اسے ضبطِ تحریر میں لانا گناہ تصور کیا جاتا تھا اس لئے یہ روایۃً سینہ بسینہ برہمنوں کے ہاں منتقل ہوتا رہتا تھا۔ اس اعتبار سے اس کا نام سمرتی (روایات یا سنی ہوئی باتیں) ہے۔ (داس گپتا صفحہ ۱۲)

چار وید

سمہت کے مجموعے کے چار حصے ہیں اور ان ہی کو چار وید کہا جاتا ہے یعنی رگ وید، سام وید، یجر وید، اتھر وید۔ عام طور پر رگ وید کو سب سے پرانا تسلیم کیا جاتا ہے

---

[1] یہ کتاب اپنے موضوع پر بہت اہم ہے۔ آیندہ اوراق میں اس کے اکثر اقتباسات سامنے آئیں گے۔ بنظر اختصار ہاں اسے صرف "داس گپتا" کے الفاظ سے متعارف کرایا جائے گا۔

اگرچہ پرانوں کی رُو سے سب سے پہلے یجر وید تھا۔ اس کو توڑ پھوڑ کر چار وید بنا لئے گئے۔" (ہندوازم صفحہ ۹۳) سام وید کی اپنی حیثیت الگ نہیں۔ اس میں (۷۵) اشلوکوں کے سوا سب کچھ رگ وید سے اخذ کردہ ہے۔ یجر وید میں بعض حصے رگ وید کے ہیں اور بعض اپنے۔ البتہ اتھروید رگ وید سے مختلف ہے اور پروفیسر میکڈونل کی تحقیق کی رُو سے عہدِ کہن کے تصورات کا مظہر ہے۔ (HISTORY OF SANSKRIT LITERATURE)

شروع میں وید ایک ہی تھا جسے (کہا جاتا ہے کہ) رشی ویاس جیؒ نے چار حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اس تقسیم سے پہلے ایک زمانہ ایسا بھی آیا جب یہ وید بالکل ضائع ہو چکا تھا لیکن ایک رشی نے اسے محفوظ رکھا اور اس نے پھر اُسے آگے منتقل کیا۔ چنانچہ مہابھارت میں لکھا ہے:۔

ایک مرتبہ ملک میں بارہ برس تک سخت قحط سالی رہی۔ تمام رشی دیش چھوڑ کر تلاش معاش میں کہیں دوسری جگہ چلے گئے اور وید کو قطعاً بھلا بیٹھے۔ لیکن دریائے سرسوتی کا بیٹا رشی سرسوت اپنے دیس میں رہا اور ایک مچھلی پر گذارہ کرتا رہا جو اس کی ماں (دریائے سرسوتی) اسے روزانہ دے دیتی تھی اس نے وید یاد رکھا اور جب رشی واپس لوٹے تو انہیں دوبارہ یاد کرایا۔ (ہندوازم صفحہ ۸۲)

موجودہ وید

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ وید جسے رشی سرسوت نے ازسرِنو دوسرے رشیوں کو پڑھایا تھا اور جسے بعد میں رشی ویاس جی نے چار حصوں میں تقسیم کر دیا، کیا آج بجنسہٖ ہمارے پاس موجود ہے۔ اس کے متعلق سترگووند داس لکھتے ہیں:۔

ہم نہایت آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ کتابیں جو آج ہمارے پاس ہیں ویاس کے مرتب کردہ نسخہ کے مطابق نہیں ہیں۔ اس لئے کہ روایات کی رُو سے ویاس جی کئی ہو گزرے ہیں اور اس کے علاوہ ویدوں کے کئی اور ترتیب دہندگان۔ سمرت لٹریچر جو آج ہمارے پاس ہے وہ تو اس مجموعہ کا پانچواں حصہ بھی نہیں جو آج سے قریب ۲۲۰۰ سال پیشتر مہابھاشا کے زمانہ میں موجود تھا۔

(ہندوازم۔ صفحہ ۸۴)

یہی صاحب ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ رگوید کی تدوین کے زمانہ میں ہی اصلی منتر (جنہیں رگوید میں علی الحساب اکٹھا کر کے رکھ دیا گیا تھا) کھو چکے تھے اور ان کی فقط نامکمل سی یاد ذہنوں میں باقی رہ گئی تھی۔

(ایضاً صفحہ ۹۴۲)

(۰)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سمرت لٹریچر (یا ویدوں) کی تصنیف کا زمانہ کونسا ہے۔ یہ مسئلہ

لہ ان کے متعلق تفصیل ذرا آگے چل کر ملے گی۔

تصنیف کا زمانہ

اس وقت تک یقینی طور پر طے نہیں ہو سکا اور اس کے متعلق جو کچھ تحقیق کیا گیا ہے قیاسات پر مبنی ہے۔ اس لئے کہ جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے، ہندوؤں کے ہاں ان کے عہد قدیم کی تاریخ محفوظ نہیں۔ اور جب کسی قوم کی تاریخ محفوظ نہ ہو تو ازمنۂ گزشتہ میں اس کے احوال و کوائف کے متعلق یقینی طور پر کیا کہا جا سکتا ہے؟ بالخصوص جب اس کے ساتھ یہ جذبۂ عقیدت بھی شامل ہو کہ کسی شے کی قدامت اس کی عظمت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ مثلاً رامائن اور مہابھارت کے واقعات کے متعلق عام طور پر یہ بتایا جاتا تھا کہ انہیں لاکھوں برس کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اخبار تیج دہلی کے کرشن نمبر مورخہ ۷ ستمبر ۱۹۳۹ء میں سوامی اتو بھوانند جی لکھتے ہیں:-

> ہماری ہندو جاتی میں سب سے زیادہ برگزیدہ اور متبرک ہستیاں دو ہوئی ہیں۔ ایک مہاراجہ رام چندر والی اودھ۔ اور دوسرے بھگوان کرشن والی دوارکا ... ہندو تاریخ کے مطابق رام اور راون کی لڑائی کو آٹھ لاکھ چونسٹھ ہزار سال ہوتے ہیں۔

جب رامائن کے واقعہ کی قدامت کی یہ کیفیت ہے تو ویدوں کے متعلق ظاہر ہے کہ انہیں کس قدر قدیم قرار دیا جائے گا چنانچہ ویدوں کے متعلق ہندوؤں کا مقدس عقیدہ یہ ہے کہ یہ زمانہ کی حدود سے ماوراء ہیں۔ یعنی ازلی ہیں۔ اسی سے یہ عقیدہ بھی ان کے ہاں مروج ہے کہ سنسکرت زبان بھی ازلی اور قدیمی ہے۔ لہذا ویدوں کی تصنیف و تدوین کا زمانہ متعین کرنے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ آریا جن کے ہاں وید مروج تھے، کون لوگ تھے اور ان کی زبان کہاں سے آئی۔

تاریخ ہند میں قیاسات کا رخ اس طرف جاتا ہے کہ کسی ابتدائی زمانہ میں وسط ایشیا میں ایک قوم رہتی تھی جس کا ایک حصہ مشرق کی جانب بڑھا اور کوہ ہندوکش کے راستے ہندوستان میں داخل ہوا۔ انہوں نے یہاں کے اصل باشندوں کو مفتوح و مغلوب کیا اور گنگا اور جمنا کی وادیوں میں سکونت پذیر ہو گئے۔ ان کا نام آریہ تھا۔ سیامک (جسے ایرانی اپنا پیغمبر مانتے تھے) کا دوسرا نام پارسا تھا۔ اسی کے نام پر ایران کا دوسرا نام پارس ہوا۔ سیامک کے بعد ہوشنگ کو پیغمبری ملی جس کا دوسرا نام ایران شاہ تھا۔ لہذا فارس کا دوسرا نام ایران مشہور ہوا اور اس ملک کے رہنے والے ایرانی یا ایرین یا آریا کے نام سے موسوم ہوتے۔ بعض مستشرقین[1]

آریہ

کا خیال ہے کہ لفظ آریا کا مادہ "آر" ہے جس کے معنی کاشتکار کے ہیں۔ بہرحال لفظ آریا کی تحقیق کے متعلق خیالات مختلف ہوں تو ہوں، لیکن یہ قیاس قریب قریب متفق علیہ ہے کہ یہ قوم وسط ایشیا

لہ ایران میں قدیم زمانہ کے بعض ایسے کتبے ملے ہیں جن میں ایرانی بادشاہوں کے ساتھ آریا کا لفظ لکھا ہوا ہے۔ مثلاً شاہ گستاسپ کے نام کے ساتھ۔ اسی طرح قدیم یونانی مورخ ہیروڈوٹس نے ایران کے کئی بادشاہوں کے نام کے ساتھ آریا کا لفظ لکھا ہے۔

سے نکل کر ان ہی راستوں سے ہندوستان آئی تھی۔ چنانچہ ڈاکٹر ہنٹر اپنی کتاب تاریخ ہند میں لکھتے ہیں :-

ہند میں آنے والے آریوں کے اپنے وطن میں رہنے اور وہاں سے جنوب مشرق کی سمت سفر کرنے کا حال ویدوں کے بھجنوں سے بخوبی منکشف ہوتا ہے۔ پہلے یہ کابل میں درہ خیبر کے شمال تک پہنچے اور پھر پنجاب سے گنگا تک وارد ہونے کی خبر دیتے ہیں۔

قدیم ایرانیوں اور ہندوستان کے ان آریوں میں زبان اور عقاید کے اعتبار سے اس قدر اشتراک پایا جاتا ہے کہ ان دونوں کے ایک ہونے (یا کم از کم کسی زمانہ میں اکٹھے رہنے) میں کسی شعبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ قدیم فارسی زبان کی تین مختلف زبانوں کے نمونے ہمارے سامنے ہیں۔ ایک ژند اوستا کی زبان۔ دوسرے پہلوی زبان جو ژند کے بعد مروج ہوئی۔ تیسرے دری زبان جو پہلوی کے بعد ساسانی عہد میں رائج ہوئی۔ جس قدر مشابہت ژند اوستا کی زبان اور دری زبان میں ہے، اسی قدر مشابہت ژند اوستا اور سنسکرت زبان میں ہے۔ چنانچہ بعض یورپی علمائے سنسکرت کا قول ہے کہ ویدک گیت کا ہر ایک مصرعہ اوستا کی زبان میں اور اوستا کا ہر ایک جملہ ویدک زبان میں ذرا سی تبدیلی سے مبدل ہو سکتا ہے"۔ (مقدمہ تاریخ ہند قدیم۔ از شاہ اکبر خاں صاحب مرحوم) حتیٰ کہ ژند کی زبان کی طرز نگارش یعنی حروف کی شکلیں اکثر سنسکرت کی صورت سے مشابہ ہیں۔ چنانچہ ایران میں غیر معروف قدیمی مخروطی حروف میں لکھے ہوئے ایسے کتبے ملے ہیں جن کی زبان سنسکرت سے مشابہ اور ژند اوستا کی زبان ہے۔ ادھر ہندوستان میں ایسے قدیمی سکے ملے ہیں جن پر قدیمی پہلوی حروف سے مشابہ حروف پائے گئے ہیں جو داہنی جانب سے بائیں جانب کو لکھے گئے ہیں۔ آج بھی فارسی اور سنسکرت زبان میں سینکڑوں الفاظ ایسے ملیں گے جو آپس میں پوری مشابہت رکھتے ہیں۔ ان حقائق کے پیش نظر محققین کی یہی رائے ہے کہ سنسکرت زبان قدیم فارسی زبان سے ہی بنی تھی۔ یا کم از کم یہ کہ دونوں کا ماخذ ایک ہے۔ (آریوں۔ اور ڈراوڑیوں کے اصلی وطن ہندوستان کی طرف انتقال۔ ان کی زبان اور معاشرت وغیرہ کے متعلق تحقیقات جدیدہ کا رُخ جن اور گوشوں کی سمت پلٹا ہے اس کا اجمالی ذکر اسی عنوان کے اخیر میں کیا جائے گا) اس اعتبار سے سنسکرت زبان کے قدیمی اور ازلی ہونے کا عقیدہ بلا دلیل ہے۔ چنانچہ مسٹر گوونڈ داس اس باب میں رقمطراز ہیں :-

یہ مقدس تعلیم کہ سنسکرت دیوجا بھاشا (یعنی دیوتاؤں کی زبان) ہے اور دنیا میں سب سے زیادہ قدیم زبان ہے چپکے سے مسترد کر دینی چاہیئے کیونکہ تاریخ اس دعویٰ کا کافی بطلان کر چکی ہے۔

(ہندو ازم۔ صفحہ ۱۴۶)

عقاید کا اشتراک

اب رہا عقاید کا اشتراک۔ سو زرتشتی مذہب اور ویدوں کے عقاید کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد انسان لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ یہ دونوں قریب قریب

ایک ہی مذہب کی دو مختلف شکلیں ہیں۔ قدیم آریا جب ایران (یا وسط ایشیا) سے ہندوستان کی طرف آئے تو ظاہر ہے کہ اپنے رسوم و عقاید بھی ساتھ ہی لائے ہوں گے جب ایران میں زرتشت کا ظہور ہوا تو وہاں کے قدیم مذہب (آبادی کا مذہب) میں بھی تبدیلی ہو گئی۔ ہندوستان کے آریوں کے ایرانیوں کے ساتھ روابط قائم تھے۔ انہوں نے اس تبدیلی کو بدعت قرار دیا اور اس کے خلاف احتجاج کیا۔ ایران کے شاہ گشتاسپ نے ہندوستان کے سب سے بڑے عالم سنگراچہ تا سنگرانکاچہ کو کہلا بھیجا کہ تم خود آکر زرتشت سے ملو اور شکوک رفع کر لو۔ دبستان مذاہب میں اوستا، دساتیر اور سنگرانکاچہ نامہ کی تصریحات کے مطابق سنگرانکاچہ اور زرتشت کی ملاقات وغیرہ کا حال تفصیلاً لکھا ہے۔ سنگرانکاچہ زرتشت کا معتقد ہو گیا اور اوستا کا ایک نسخہ لے کر ہندوستان آیا۔ یہاں آکر زرتشت کے مذہب کو پھیلایا۔ چنانچہ ہزار آدمی اس کے مطیع ہو گئے اور زرتشت کے نام پر ایک تہوار بھی منایا جانے لگا۔ سنگرانکاچہ

ویاس جی

کے مقابلہ میں یہاں ایک اور عالم ویاس جی تھے۔ انہوں نے جب یہ کیفیت دیکھی تو زرتشت سے مناظرہ کے لئے بلخ کا سفر اختیار کیا۔ زرتشت سے مناظرہ کے بعد ویاس جی بھی ان کے معتقد ہو گئے اور ان کے مذہب کے مبلغ بن کر ہندوستان واپس آئے۔ یہاں پہنچکر انہوں نے ان متفرق اشعار کو جو اس وقت تک عام لوگوں میں منتشر تھے، جمع کیا اور اپنے جدید مسلک کو ان میں شامل کر کے وید مرتب کیا۔ ویاس جی کے متعلق خود ہندوؤں کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ وہ وید کے مرتب کرنے والے ہیں۔ اس پس منظر کے بعد حقیقت اچھی طرح سے واضح ہو جاتی ہے کہ ویدوں کے عقاید و رسوم اور زرتشتی مذہب میں اس قدر مشابہت کیوں پائی جاتی ہے۔ مذہب زرتشت میں آگ کی پرستش ہوتی ہے۔ ویدوں کی رُو سے بھی اگنی قابلِ پرستش دیوتا ہے۔ رگوید منڈل ۲ سوکت ۲ رچا ۱۲ میں ہے۔

> اگنی امرت کا مالک ہے دولت کا مالک ہے، وہی مستحکم خاندان دینے والا ہے۔ اے طاقت والے ایسا نہ کر کہ ہم تیرے غلام بلا اولاد، بلا خوبی اور بغیر چڑھاؤں کے رہ جائیں۔ کیا ہم نیک اگنی کی نعمتوں سے گھرے ہوں گے؟ کیا ہمیں دائمی دولت ملے گی؟ اے اگنی! ہم کسی غیر قوم سے نہیں نکلے ہیں۔ تو ہی رستہ لے جو تجھے ہمارے پاس پہنچا دے۔ اگر صرف وہی خون نہ ہوتا جو ہم میں ہے تو پھر اگنی کو چڑھاوے کہاں سے ملتے اور کون اس کی پرستش کرتا۔ اسے پورا حق اس مکان میں رہنے کا ہے جسے ہم نے اس کے لئے خاص کیا ہے۔ آ ہمارے پاس اے قومی محمد اور پرستش کے لائق دیوتا۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ وید میں جو مفہوم منتر کا ہے وہی مفہوم اوستا میں منتھر کا ہے۔ اوستا میں جس چیز کو ہوما کہا گیا ہے اس کو وید میں سوما کہا گیا ہے۔ ژند اوستا میں متر یا متھر ایک بہت بڑا قابلِ تعظیم "خدا" ہے۔ اس کے متعلق لکھا ہے کہ "وہ ہمیشہ سچ بولتا ہے۔ اس کے ایک ہزار کان، دس ہزار آنکھیں ہیں اور ہمیشہ بلا اونگھے حفاظت کی خدمت

کی نگرانی کرتا ہے؟ رگوید منڈل ۳ سوکت ۵۹ میں اسی متر کے متعلق لکھا ہے کہ متر قوموں پر ہمیشہ بلا آنکھ بند کئے نظر رکھتا ہے۔ متر کے آگے گھی کے ساتھ نذر دلاؤ۔" ژندا وستا میں جس فرشتہ ارمین کا ذکر ہے اسے رگوید منڈل ۱

ویدا اور زرتشتی تعلیم

سوکت ۱۳۶ میں ارمین دیوتا کہہ کر پکارا گیا ہے۔ ژندا وستا کے مذہب میں سورج کی بڑی تعظیم ہے۔ اسی طرح رگوید میں سورج کو دیوتا قرار دیا گیا ہے۔ وایو دیوتا ژندا وستا اور رگوید دونوں میں موجود ہے۔ اوستا میں فریتونا سب سے پہلا حکیم بیان کیا گیا ہے۔ رگوید اور یجروید میں ترتیا کو بیماریوں کا اچھا کرنے والا دیوتا کہا گیا ہے۔ قربانی چڑھانے والوں کو ژندا وستا میں اتھروہ اور ویدوں میں اتھروان کہا گیا ہے۔ ان کے علاوہ قربانیوں کے طریقے اور عبادت کے وقت کی دعائیں پارسیوں کی کتابوں اور ویدوں میں بہت ملتی جلتی ہیں۔ ہندو جس طرح ایک خاص عمر میں لڑکے کے گلے میں زنار کا تاگہ ڈالتے ہیں ایرانی بھی اسی طرح ڈالتے تھے۔ ژند کی زبان میں ہوم کے معنی آگ جلانا اور اس میں کچھ چیزیں ڈالنا ہے۔ اسی کو ہندو ہون کہتے ہیں۔ آتش پرستوں کے صبح شام کے گانے کے منتروں کو گاتھا کہتے ہیں۔ ہندو اس قسم کے منتروں کو گائتری کہتے ہیں۔ یہاں جس طرح موسم سرما کی آمد پر دوالی کا تیوہار مناتے ہیں، ایران میں آتش پرست، آتش سوز یا چراغاں کا تیوہار مناتے تھے۔ یہاں جو کچھ ہولی کے تیوہار پر ہوتا ہے وہی کچھ آتش پرستوں میں "کوسہ برنشین" تیوہار میں ہوتا تھا۔ یہاں بسنت کا تیوہار وہی ہے جو آتش پرستوں میں "جشن گل کوبی" تھا۔ ہندو دھرم کی بنیاد ورنوں (ذاتوں) کی تقسیم پر ہے۔ یہی تقسیم ایرانیوں میں موجود تھی۔ اوّل برہمان (زہاد و علماء) ان کو یہاں برہمن کہا جاتا ہے۔ دوم چیتریتی (بادشاہ، یا پہلوان جن کے چتر، سائبان کی حفاظت میں زندگی بسر کی جائے)۔ یہی یہاں کے چھتری ہیں۔ سوم باس یا بیش (تاجر و کاشتکار) جنہیں یہاں ویش کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ چہارم سوئن یا سود (خدمت گار) یہ یہاں کے شودر ہیں۔ ان ہی چیزوں کے پیشِ نظر محققین اب اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ

ویدصاف طور پر زرتشت کی تعلیم کے مہین ہیں۔

(RESEARCHES IN ORIENTAL HISTORY. P. 131)

آریوں کے اصل مسکن، ان کے نقل مکانی، ایرانیوں اور آریوں کے باہمی روابط و ضوابط اور مذہب زرتشت اور ویدک دھرم کی مشابہت و مماثلت کے پیشِ نظر ویدوں کی تصنیف و تدوین کے زمانہ کے تعین کے لئے کچھ دھندلی سی

ویدوں کا زمانہ تصنیف

تاریخی روشنی مل جاتی ہے۔ اگرچہ مسٹر بال گنگا دھر تلک ان کی تصنیف کا زمانہ سنہ ۴۰۰۰ ق م اور مسٹر ہاگ (HAUG) قریب ۲۴۰۰ ق م قرار دیتے ہیں۔ لیکن پروفیسر میکس ملر (MAX MULLER) کی تحقیق کی رو سے ان کا زمانہ زیادہ سے زیادہ سنہ ۱۲۰۰ ق م قرار دیا جا سکتا ہے۔ پروفیسر ملر ویدوں کے عہد کو چار حصوں پر تقسیم کرتے ہیں:

(۱) سونز لٹریچر ۲۰۰۰ سے ۶۰۰ ق م تک
(۲) براہمن ۶۰۰ سے ۸۰۰ ق م تک
(۳) منتر ۸۰۰ سے ۱۰۰۰ ق م تک
(۴) چھند (رگوید کے آخری حصہ سمیت) ۱۰۰۰ سے ۱۲۰۰ ق م تک

(COMBRIDGE HISTORY OF INDIA, PART I, P. 112)

ویدوں میں بالعموم رگوید کو سب سے قدیم قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے متعلق ڈاکٹر داس گپتا لکھتے ہیں:۔

رگوید کے منتر نہ تو کسی ایک شخص کی تصنیف ہیں، نہ کسی ایک زمانہ کی۔ یہ منتر غالباً مختلف زمانوں میں مختلف رشیوں نے تصنیف کئے اور یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ ان میں سے بعض منتر آریوں نے ہندوستان میں آنے سے پیشتر تصنیف کئے ہوں۔ یہ منتر تمام سینہ بسینہ چلے آتے تھے اور ہر زمانہ کے شاعران میں رفتہ رفتہ اضافہ کرتے رہتے تھے۔ غالباً جب یہ مجموعہ بہت ضخیم ہوگیا تو اسے موجودہ شکل میں مدون کیا گیا۔ اس لئے ان میں دراصل آریوں کے ہندوستان میں آنے سے پہلے اور بعد کے زمانہ کی ترقی کے مختلف ادوار کی جھلک دکھائی دیتی ہے اور عہدِ قدیم کی اس سوسائٹی کے انداز و اطوار کا پتہ چلتا ہے جس نے انہیں تصنیف کیا۔ (صفحہ ۱۵)

کیسے تصنیف ہوئے

اس سے ظاہر ہے کہ وید دراصل کیا ہیں، اور ان کی تصنیف کس طرح ہوئی۔ یعنی مختلف زمانوں میں مختلف شاعروں نے (جس قسم کے شاعر اُس زمانۂ قدیم میں ہو سکتے تھے) اپنے ماحول، معاشرہ، بود و باش، رسوم و روایات، قصص و حکایات کے متعلق جو کچھ نظم کیا وہ آریوں کی خانہ بدوشی کی زندگی اور بعد میں کاشتکاری کے زمانہ میں زبان زد خلائق تھا۔ جس طرح قدیم زمانہ کے بعض منظوم قصے آج کل بھی دیہات میں مروج ہیں، بعد میں ویاس جی نے ان میں اپنے مسلک و خیالات کا اضافہ کر کے انہیں مدوّن کر دیا۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں بعض تعلیم الہامی بھی ہو۔ لیکن نہ تو تاریخ اس کے متعلق کچھ بتا سکتی ہے اور نہ ہی جس مسخ شدہ صورت میں وہ آج ہمارے سامنے ہیں۔ اس سے اس کے متعلق حتمی طور پر کچھ کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس کی شہادت خود ہندوؤں کی مقدس کتب میتا پوران سے ملتی ہے۔

اس ایک وید میں متعدد بار تحریف ہوئی ہے .... رشیوں کی نسلوں نے اس میں نگاہ کی خرابی اور دل کی لغزش کی وجہ سے بہت سی اختلافی چیزیں داخل کر دیں۔ منتروں، برہمنوں اور کلپ سوتروں کے نسخ میں بہت سی تبدیلیاں ہوگئیں اور رگ، یجر اور سام وید بار بار مدون ہوئے۔ پہلے بھر ایک ہی تھا۔ پھر اس کے دو حصے ہوگئے اسی طرح دواپر زمانہ میں تینوں ویدوں میں خلفشار واقع ہوگیا۔ (میتا پوران۔ بحوالہ ہندو ازم صفحہ ۹۰)

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہوگی کہ وید کسی ایک زمانہ کی تصنیف نہیں بلکہ عرصۂ دراز پر پھیلے ہوئے لٹریچر کا مجموعہ ہیں جو سینہ بسینہ چلا آتا تھا۔ اس میں مرورِ زمانہ سے ردّ و بدل بھی ہوتا رہا اور حک و اضافہ بھی۔ ویاس جی کے زمانہ میں جو کچھ ان کے سامنے تھا --- اسے ایک جگہ مدوّن کیا گیا۔ لیکن اس کے بعد بھی اس میں برابر تحریف ہوتی رہی چنانچہ مسٹر گوونداس اس حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

> اس بیان سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے (جسے اکثر اوقات دیدہ دانستہ نظر انداز کر دیا جاتا ہے) کہ ہندومت آہستہ آہستہ مختلف زمانوں میں اپنی خصوصیات کو اولتا بدلتا رہا۔ کسی خاص زمانہ کو منتخب کر کے اس مذہب اور اس کی رسوم کو سناتنی (ازلی) کہنا ایک مقدس فریب ہے۔
>
> (ہندوازم۔ صفحہ ۲۷)

(٠)

وید کب تحریر میں آئے

اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب وید سینہ بسینہ آگے منتقل ہوتے چلے آرہے تھے تو پھر یہ ضبطِ تحریر میں کب آئے۔ اس لئے کہ وہی تحریر شدہ نسخہ جس سے یہ سلسلہ نقل و کتابت آگے بڑھا قابلِ اعتماد سمجھا جاسکتا ہے۔ مثلاً آج ویدوں کا ایک مطبوعہ نسخہ آپکے سامنے آتا ہے۔ اس سے فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ نسخہ کس نسخہ سے نقل کیا گیا ہے۔ اسی طرح اس سلسلہ کو پیچھے کی طرف لوٹا دیا جائے تو بالآخر کسی ایک نسخہ تک پہنچنا پڑے گا جس سے یہ سلسلہ آگے بڑھا تھا۔ لیکن یہاں بھی وہی مشکل ہے جو ویدوں کی زبان کے مسئلہ میں لاحق ہو رہی تھی۔ یعنی تاریخ اس کے متعلق بھی خاموش ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ مستند نسخہ جس سے یہ سلسلہ آگے بڑھا کون سا اور کہاں ہے؟ اس کے ساتھ ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ہندوستان میں تحریر کا رواج کب سے شروع ہوا۔ پروفیسر میکس ملر (جو سنسکرت زبان کا مشہور عالم اور محقق گذرا ہے) کی تحقیق یہ ہے کہ ہندوستان کے مشہور جغرافیہ نویس (پانی) کے زمانہ تک اس ملک میں کوئی شخص فنِ تحریر سے واقف نہ تھا۔ پانی کا زمانہ اس مستشرق نے ۳۵۰ ق م مانا ہے۔ لیکن ڈاکٹر ویبر نے پانی کا زمانہ آٹھویں صدی قبل مسیح قرار دیا ہے[1]۔ ڈاکٹر ڈیویڈس نے اپنی کتاب (BUDHIST INDIA) میں لکھا ہے کہ ڈراوڑی تاجر قریب سات آٹھ سو سال ق م میں عراق عرب سے سامی حروف لائے۔ اور ان ہی حروف کی مدد سے یہاں فنِ تحریر کی ابتدا ہوئی۔ لیکن مذہبی کتابوں کی تحریر کا رواج بدھوں کے عہدِ حکومت سے

---

[1] مسٹر گوونداس لکھتے ہیں کہ "اس امر کے ثبوت کے لئے کوئی دلیل نہیں ملتی کہ ۳۵۰ ق م سے پیشتر ہندوستان میں تحریر کا رواج تھا۔" (ہندوازم - صفحہ ۱۵۳)

پہلے نہیں ہوا - ادھر اگر دیاس جی کو ویدوں کا مرتب تسلیم کر لیا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ وہ سب سے پہلے ویدوں کو حیطۂ تحریر میں لاتے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے پارسیوں کے دساتیر سے ویاس جی کے زرتشت کے پاس جانے کا حال معلوم ہوتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وید سب سے پہلے قریب چھ سو سال ق.م تحریر میں لائے گئے (کیوں یہی زمانہ جناب زرتشت کا قرار پا سکتا ہے) لیکن ویدوں کو لکھنے کا عام رواج اس زمانہ میں نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ البیرونی نے اپنی کتاب الہند میں لکھا ہے کہ اس کے زمانہ میں بھی ویدوں کو ضبطِ تحریر میں لانے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی - اور اس کے ہندوستان میں آنے سے کچھ عرصہ پہلے (سنہ ...) میں ایک کشمیری پنڈت نے ویدوں کو کتابی صورت میں لکھا تھا۔ لیکن آج اس نسخہ کا بھی کسی کو علم نہیں کہ کیا ہوا۔ بہرحال اس امر کے متعلق یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ویدوں کا سب سے پرانا نسخہ کونسا ہے اور وہ کہاں ہے؟

(۹)

ویدوں کے مصنف کون تھے

اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ویدوں کو تصنیف کس نے کیا؟ ظاہر ہے کہ جب تاریخ کی رُو سے ویدوں کی تصنیف کا زمانہ ہی متعین نہیں ہو سکتا تو ان کے مصنفین کا تعین کس طرح ہو سکتا ہے! لیکن خود ویدوں میں جن مصنفین کے نام موجود ہیں ان ہی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ کس کی تصنیف ہیں۔ ویدوں کا انداز یہ ہے کہ ہر ایک منتر کا کوئی نہ کوئی رشی اور کوئی نہ کوئی دیوتا ہوتا ہے۔ متکلم کا نام رشی ہوتا ہے اور مخاطب یا موضوعِ سخن کا نام دیوتا۔ یہ رشی ان وید منتروں کے مصنف سمجھے جاتے ہیں۔ چنانچہ وید منتروں میں ان رشیوں کے نام موجود ہیں۔ مثلاً رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۹۳ منتر ۱۷ میں رشی کا نام پلیت کا بیٹا گئے لکھا ہے۔ رگوید منڈل ۳ سوکت ۳۳ منتر ۵ کا رشی کشک کا بیٹا وشوامتر ہے جو منتر کو اس طرح شروع کرتا ہے "میں وشوامتر جو کشک کا بیٹا ہوں" رگوید منڈل ۱ سوکت ۱۷۹ منتر ۱ کی مصنفہ کا نام لوپامدرا ہے جو اپنا حال یوں بیان کرتی ہے۔

> بدنامی برہمچاری رشی نے کہیں سے اچانک آکر مجھ سے ...... زبردستی کی۔ لوپامدرا سسکیاں لے لے کر روتی ہوئی فریاد کرتی ہے۔

رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۸۵ کی رشی (مصنفہ) سوریا ساوتری ہے جو اس سوکت میں اپنی شادی کا حال لکھتی ہے۔ رگوید منڈل ۸ سوکت ۱۹ منتر ۳۶ کا رشی سوبھری کنو لکھتا ہے۔

> پروکتس کے بیٹے ترس دسیو راجہ نے مجھ رشی کو سواستو ندی کے تیر پر پچاس راشیاں اور ۲۱۰ کالے رنگ کی گائیں خیرات دیں۔

اسی طرح تمام ویدوں میں رشیوں کے نام اکثر و بیشتر منتروں میں درج ہیں۔ یہ تو ہے انسان رشی۔ اس سے آگے بڑھیئے تو رگوید منڈل ۸ سوکت ۶۷ منتر ۵ میں جال میں پھنسی ہوئی مچھلیاں اپنا حال بیان کرتی ہیں۔ اور اپنی رہائی کے لئے آدیتہ دیوتا کو مدد کے لئے بلاتی ہیں۔ رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۱۰۸ منتر ۲ کی رشی، دیوتاؤں کی کتیا سرما نامی ہے جسے اندر دیوتا نے ہر اپنی کی مسروقہ گایوں کا کھوج نکالنے کے لئے اسروں کے پاس بھیجا تھا۔ دوسری جگہ (رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۱۴ منتر ۱۰ تا ۱۱ میں) اس کتیا کے بچوں کا حال یوں لکھا ہے۔

اے سرما کے دو بچو۔ چار چار آنکھوں والو اچھے راستے سے یہاں آؤ جو تیرے یم کے محافظ چار آنکھوں والے دو کتے ہیں۔

عجیب و غریب رشی

کسی جگہ وید منتروں کا رشی کبوتر ہے (رگوید منڈل ۱۰، سوکت ۱۶۵ منتر ۱)۔ اتھروید کانڈ ۴ سوکت ۷ منتر ۱ کا رشی نیل کنٹھ ہے۔ سام وید میں ایک رشی توشٹا کا بیٹا تین سروں والا لکھا ہے۔ شت پتھ برہمن میں (جسے ویدوں کی الہامی تفسیر مانا جاتا ہے) اس کا حال یوں درج ہے۔

"اس کے تین سر اور چھ آنکھیں تھیں۔ ایک منہ سوم پیتا تھا، دوسرا شراب پیتا تھا اور تیسرا اناج کھاتا تھا ...... اس سے اندر نے لڑائی کی تھی، اور اس کے تینوں سروں کو کاٹ ڈالا وہ جو سوم رس پینے والا منہ تھا اس سے کوا پیدا ہوا اور جو شراب پینے والا منہ تھا اس سے کال کلیجی پیدا ہوئی ...... اور جو کھانا کھانے کے لئے منہ تھا اس سے تیتر پیدا ہوا۔"

رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۷۶ کا رشی کدرو کا بیٹا اربد نامی[1] سانپ لکھا ہے حتیٰ کہ رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۳۴ کا رشی جوئے کا پانسہ ہے۔ چنانچہ مہارشی یاسک اچاریہ جی مہاراج دیرانگ نرکت (۹-۱-۸) میں لکھتے ہیں کہ:

"یہ منتر یا سوکت الٹے پڑے ہوئے جوئے کے پانسے کا کلام ہے۔"

رگوید منڈل ۳ سوکت ۳۳ منتر ۲-۳ ; ۵ تا ۶ کے رشی ستلج اور بیاس کا دریا ہیں جو وشوامتر سے

---

[1] "انسان کا بیٹا سانپ" وجہ تعجب نہیں ہونا چاہیئے۔ سوامی دیانند نے ستیارتھ پرکاش (صفحہ ۱۹۱) پر اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ایسا ہی بھاگوت میں لکھا ہے کہ اوتی کے بطن سے آدیتہ۔ ونتا کے بطن سے پرندے، کدرو کے بطن سے سانپ، سرما کے بطن سے کتے، گیدڑ وغیرہ، اور دیگر عورتوں کے بطن سے ہاتھی، گھوڑے، اونٹ، گدھے، بھینسے، گھاس پھونس اور ببول وغیرہ کے درخت کانٹوں سمیت پیدا ہوئے۔"

باتیں کرتے ہیں۔

تصریحات بالا سے ظاہر ہے کہ وید منتر مختلف لوگوں کی تصنیف ہیں۔ ان میں انسانوں کے علاوہ پرندوں، جانوروں، درختوں، پہاڑوں، دریاؤں کی زبان سے بھی بہت سی باتیں درج ہیں۔ اس الجھاؤ کے پیش نظر ویدوں کے ہندو عالم حیرت میں رہ جاتے ہیں کہ انہیں الہامی (یا خدا کا کلام) کیسے مانا جائے۔ چنانچہ گروکل مہاودیالہ جوالاپور کے سکھیا پنڈت نرولوست شاستری وید تیرتھ اپنی تصنیف رگوید آلوچن صفحہ ۶۱ پر لکھتے ہیں۔

> کئی سوکتوں میں امک (فلاں) کے پتر (فلاں)، امک نے اس سوکتر (سوکت) کو رچا بنایا۔ ایسا سپشٹ (صریح) لیکھ (لکھا) ہے۔

جس کے پیش نظر وہ (صفحہ ۱۹۷) پر لکھتے ہیں کہ

> جب ہم براہم وادی پکش (ویدوں کے الہامی ہونے) کی درشٹی (نقطۂ نگاہ) سے اس پر (غور) کرنے لگتے ہیں تو کہیں کہیں منتروں میں ایک کٹھنتا (مشکل) آپڑتی ہے۔ وہ یہ کہ کہیں کہیں منتر درشٹا رشی (منتر بنانے والے رشی) کا نام بھی منتر میں مل جاتا ہے۔ تب (سندیہہ) شبہ ہوتا ہے کہ یہ کیا بات ہے؟

(باقی آئندہ)

انسانی مسائل کے حل

عقلِ انسانی آج تک کن کن ارتقائی مراحل سے گزری اور اس نے کہاں کہاں اور کیا کیا ٹھوکریں کھائیں۔ تاریخ انسانی کی یہ عبرت آموز تفصیل آپ کو پرویز صاحب کی مشہور کتاب

انسان نے کیا سوچا؟

میں ملے گی۔ ہزاروں کتابوں کا نچوڑ۔ افلاطون اعظم سے لیکر آج تک گزشتہ اڑھائی ہزار سال میں دنیا کے چوٹی کے مفکرین، مورخین اور علمائے اخلاقیات، نفسیات اور ماہرین معاشیات و سیاسیات نے کیا سوچا۔ اسے پڑھئے اور سوچئے کہ وحی کی روشنی سے روگرداں ہو کر نوعِ انسانی نے اپنے لئے کیا جہنم خرید لیا ہے۔

قیمت:- بارہ روپے

ملنے کا پتہ:- ادارہ طلوع اسلام ۲۵/بی گلبرگ لاہور